الرسالہ

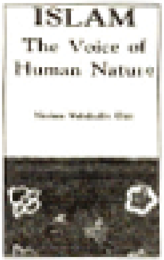
Al-Risala

February 1996 • Issue 231 • Rs. 7

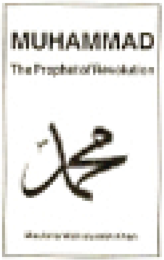
تیاری کے زمانہ میں اقدام کی بات کرنا
ایسا ہی ہے جیسے
بیج ڈالنے کے زمانہ میں فصل کاٹنے کا منصوبہ بنانا۔



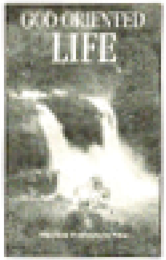
The Islamic Centre Publications



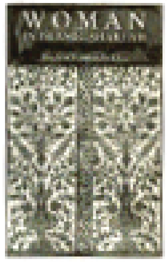
ISLAM:
THE VOICE OF
HUMAN NATURE
22x14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30



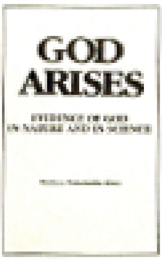
MUHAMMAD:
THE PROPHET OF
REVOLUTION
22x14.5cm, 226 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 65



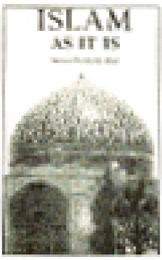
GOD-ORIENTED
LIFE
22x14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70



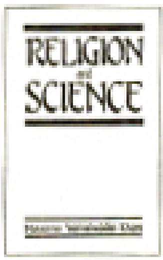
WOMAN IN
ISLAMIC SHARI'AH
22x14.5cm, 150 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 185 (Hardbound)



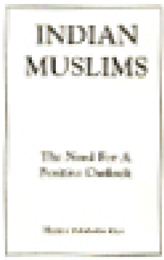
GOD ARISES
22x14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85



ISLAM AS IT IS
22x14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55



RELIGION AND
SCIENCE
22x14.5cm, 96 pages
Rs. 45



INDIAN MUSLIMS
22x14.5cm, 192 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 175 (Hardbound)

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (48 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (36 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire.

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013 Tel. 4611128 Fax: 11-4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

فروری ۱۹۹۶، شمارہ ۲۳۱

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

دلیل نبوت

رمضان کا مہینہ اسلام میں روزہ کا مہینہ ہے۔ قرآن میں صوم رمضان کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر وہ فرض کیا گیا تھا تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو (البقرہ ۱۸۳)

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مذاہب کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی چھوٹا یا بڑا مذہب ایسا نہیں ہے جس میں روزہ کا تصور موجود نہ ہو۔ ہر مذہب میں کسی نہ کسی طور پر روزہ کا رواج پایا جاتا ہے۔ انسانی معاشروں کے ایک مغربی عالم نے لکھا ہے کہ یہ مشکل ہوگا کہ کسی بھی ایسے مذہبی نظام کی نشاندہی کی جائے جس میں روزہ (fasting) کو بالکل ہی نہ مانا گیا ہو :

> It would be difficult to name any religious system of any description in which it is wholly unrecognized. (X/193)

مزید یہ کہ عرب قبائل میں اس زمانہ میں جو مذہب تھا اس میں روزہ کا رواج پایا نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ فلپ ہٹی نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے مشرکانہ سماج میں روزہ کا کوئی رواج موجود تھا :

> We have no evidence of any practice of fasting in pre-Islamic pagan Arabia. (p. 133)

ان حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے مذکورہ الفاظ محض سادہ الفاظ نہیں۔ بلکہ وہ دلیل نبوت ہیں۔ مواصلات اور معلومات کے جدید دور سے چودہ سو سال پہلے عرب کا ایک آدمی ہرگز یہ نہیں جان سکتا تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ کا رواج کسی نہ کسی طرح پایا جاتا ہے۔ جب کہ حال یہ تھا کہ اپنے قریبی معاشرہ میں وہ ایسے عمل کا مشاہدہ بھی نہیں کر رہا تھا۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خدا کے پیغمبر تھے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جو اُس وقت آپ کو اس عالمی واقعہ کی خبر دے سکے۔

رمضان کا روزہ

روزہ کا مہینہ روحانی تزکیہ کا مہینہ ہے۔ روزہ کا مہینہ خدا سے قریب ہونے کا مہینہ ہے۔ روزہ کا مہینہ ان صفات کی تربیت کا خصوصی مہینہ ہے جو کہ اسلام میں مطلوب ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں روزہ (فاسٹنگ) کے باب کے تحت درج ہے کہ اسلام میں رمضان کے مہینہ کو توبہ کے مہینہ کے طور پر منایا جاتا ہے اور صبح سے شام تک مکمل فاقہ کیا جاتا ہے:

> The month of Ramadan in Islam is observed as a period of penitence and total fasting from dawn to dusk. (IV/62)

توبہ بلاشبہ اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ حتی کہ پیغمبر اسلام کو حدیث میں نبی التوبہ کہا گیا ہے۔ (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/۱۰۵) توبہ اسلام کے پورے نظام سے اتنا زیادہ جڑا ہوا ہے کہ روزہ سمیت، کوئی بھی اسلامی عمل اس کی روح سے خالی نہیں۔

تاہم قرآن میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے اس کی جو خاص حکمت بتائی گئی ہے، وہ شکر اور تقویٰ ہے۔ قرآن کے مطابق، رمضان کے مہینہ میں روزہ رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اندر شکر اور تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو۔ (البقرہ)

قرآن کا ابتدائی نزول رمضان کے مہینہ میں ہوا۔ اس بنا پر وہ اہل ایمان کے لئے شکر گزاری کا مہینہ قرار پایا۔ کیوں کہ یہ اللہ کی عظیم نعمت ہے کہ اس نے قرآن کی شکل میں وہ ہدایت نامہ اتارا جو انسان کے لئے سچا رہنما بن سکے۔

تقویٰ سے مراد محتاط زندگی ہے۔ انسان کے لئے دونوں جہان کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں ہمیشہ احتیاط والا طریقہ اختیار کرے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے، اور روزہ کے ذریعہ لوگوں کو اسی محتاط زندگی کی تربیت دی جاتی ہے۔

روزہ سلف ڈسپلن کی سالانہ مشق ہے۔ روزہ اختیار رکھے باوجود بے اختیاری کا ایک تجربہ ہے۔ اسی آدمی کا روزہ سچا روزہ ہے جو روزہ کے عمل سے اس قسم کی ذاتی تربیت پا کر نکلے۔ جس کا روزہ اس کو حقیقی معنی میں شاکر اور متقی بندہ بنا دے۔

بے حساب اجر

قُل یا عبادِ الَّذین آمنوا اتَّقوا ربَّکم لِلَّذین اَحسنوا فی هٰذہِ الدنیا حَسنۃٌ و ارضُ اللہِ واسعۃٌ اِنَّما یوفَّی الصّابرون اَجرھم بغیرِ حِسَاب (الزمر ۱۰)

کہو کہ اے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔ جو لوگ اس دنیا میں نیکی کریں گے ان کے لیے نیک صلہ ہے۔ اور اللہ کی زمین وسیع ہے۔ بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

یہ ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے کہ کسی عمل پر بے حساب اجر دینے کا اعلان کیا جائے۔ قرآن میں اس قسم کا غیر معمولی اعلان صرف ایک عمل کے لیے کیا گیا ہے، اور وہ صبر کا عمل ہے۔

صبر کی اصل حبس ہے۔ یعنی روکنا۔ عربی میں کہا جاتا ہے: صبرتُ عن کذا (میں نے اپنے نفس کو فلاں چیز سے روک دیا۔ یا صبرتُ عما احبّ (جس چیز کو میں پسند کرتا ہوں اس سے میں نے اپنے آپ کو روکا)

عمل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے حد پر عمل کرنا۔ دوسرا ہے حد کے باہر جا کر عمل کرنا۔ ایک شخص آپ کے ساتھ حسن سلوک کرے اور آپ بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ یہ معمول کا کردار ہے۔ اس میں صبر و برداشت کا مرحلہ پیش نہیں آتا۔ یا آپ نے ایسے دین کو اختیار کر رکھا ہے جس میں آپ کے سب معاملات درست رہیں تو یہ گویا ایک حد پر رہ کر دین دار بننا ہے۔

عمل کی دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی ہر حال میں مطلوب دینی رویہ پر قائم رہے، خواہ صورت حال اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ یہ صابرانہ عمل ہے۔

یعنی دوسرا آدمی آپ کے ساتھ برا سلوک کرے تب بھی آپ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ دوسرا آپ کو اشتعال دلائے تب بھی آپ اس سے معتدل انداز میں کلام کریں۔ حق پر قائم رہنے میں بظاہر آپ کا معاملہ بگڑتا ہو تب بھی آپ حق اور انصاف سے نہ ہٹیں، بظاہر بے اصولی اختیار کرنے میں فائدہ نظر آتا ہو تب بھی آپ پوری طرح با اصول بنے رہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو آخرت میں بے حساب انعام دیا جائے گا۔ کیوں کہ انھوں نے صبر کی قیمت پر دینی عمل کیا۔

حدیث کا مطالعہ

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِی بَکْرٍ قَالَتْ - قَدِمَتْ عَلَیَّ اُمِّی وَهِیَ مُشْرِکَۃٌ فِی عَهْدِ قُرَیْشٍ۔ قُلْتُ یَارَسُولَ اللّٰهِ اِنَّ اُمِّی قَدِمَتْ عَلَیَّ وَهِیَ رَاغِبَۃٌ اَفَاَصِلُهَا - قَالَ نَعَمْ صِلِیْهَا (متفق علیہ)

اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میری (رضاعی) ماں میرے پاس مدینہ آئیں۔ اس وقت وہ شرک پر تھیں اور وہ قریش کی حلیف تھیں۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسولؐ، میری مشرک ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ مجھ سے کچھ چاہتی ہے۔ کیا میں انھیں صلہ رحمی کے طور پر کچھ دوں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، ان کو دو۔

یہ حدیث بظاہر والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارہ میں ہے، خواہ وہ مشرک اور کافر ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث کی کتابوں میں وہ اسی طرح کے باب کے تحت لکھی ہوئی ملے گی۔ مگر کسی حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف اس کے "ترجمۂ باب" کو دیکھنا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ حدیث کے متن پر گہرائی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ہی آدمی کے اوپر اس کے پورے معانی کھل سکتے ہیں۔

اس حدیث سے حقوق والدین کے مسئلہ کے علاوہ مزید یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان خاتمۂ جنگ کا معاہدہ ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مکہ کے مشرکین مدینہ آنے لگے اور مدینہ کے مسلمان مکہ جانے لگے۔

عقل عام یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اس آمد و رفت میں صرف "صلۂ رحمی" کا مسئلہ سامنے نہیں آیا۔ بلکہ اسی کے ساتھ یہ ہوا کہ شرک اور توحید پر گفتگو ہونے لگی۔ آبائی مذہب اور پیغمبرانہ مذہب کا تقابل کیا جانے لگا۔ توہم پرستانہ مذہب اور الہامی مذہب کا فرق لوگوں پر واضح ہونے لگا۔

اس طرح یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ کی تدبیر نے جنگی ماحول کو دعوتی ماحول میں تبدیل کر دیا۔ مکہ اور مدینہ میں جہاں اس سے پہلے تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی، وہ دعوت حق کی آوازوں سے گونجنے لگے، اور جب ایسا ہو جائے تو اسلام کی فتح اتنی ہی یقینی ہو جاتی ہے جتنا کہ تاریکیوں کی دنیا میں سورج کے طلوع ہونے سے سورج کا فتح یاب ہونا۔

بہتر انسان

عن ابی ھریرۃ، انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقف علیٰ ناس جلوس فقال: الا اُخبرکم بخیرکم من شرّکم۔ قال فسکتوا۔ فقال ذلک ثلاث مرات۔ فقال رجل بلیٰ یارسول اللہ اخبرنا بخیرنا وشرّنا۔ قال: خیرکم من یُرجیٰ خیرہٗ ویؤمن شرّہٗ۔

(رواہ الترمذی، کتاب الفتن)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی ایک مجلس کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا: کیا میں تم کو تمہارے اندر اچھے اور برے شخص کے بارہ میں نہ بتاؤں۔ راوی کہتے ہیں کہ لوگ چپ رہے۔ تب آپ نے تین بار یہی بات کہی۔ پھر ایک شخص نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول، آپ ہم کو ہمارے اچھے اور برے کے بارہ میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: تم میں اچھا وہ شخص ہے جس سے اس کے خیر کی امید کی جائے اور جس کے شر سے لوگ سلامت ہوں۔

یہ حدیث نہایت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اچھا آدمی کون ہے اور برا آدمی کون ہے۔ اچھا آدمی وہ ہے جس کے بارہ میں پیشگی طور پر یقین کیا جا سکے کہ جب بھی اس سے کسی کا سابقہ پیش آئے گا تو اس کو اس آدمی سے خیر ہی کا تحفہ ملے گا۔ اس سے جن لوگوں کو بھی تجربہ ہوگا درست قول اور نیک عمل ہی کا تجربہ ہوگا۔ کوئی بھی چیز اس کو اس پر آمادہ نہیں کرے گی کہ وہ لوگوں کے ساتھ خیر کے بجائے شر کا معاملہ کرنے لگے۔

ایسے آدمی کے اندر بلاشبہ شر بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کو بھی دوسروں کی طرح خلاف مزاج بات ناپسند ہوتی ہے۔ اشتعال انگیز بات پر اس کو بھی غصہ آتا ہے۔ اس کے اندر بھی نفرت اور عداوت کا طوفان جاگتا ہے۔ اس کو بھی نقصان اور زیادتی کے مواقع پر تکلیف ہوتی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود وہ اپنی اصولی حیثیت پر قائم رہتا ہے۔

وہ نفسیاتی جھٹکوں کو اپنے اوپر سہتا ہے۔ وہ خود کڑوا گھونٹ پی کر دوسروں کو میٹھا گھونٹ پلاتا ہے۔ وہ زیادتی کے واقعات کو اللہ کے خانہ میں ڈال دیتا ہے تاکہ اس کا ذہنی سکون بھنگ نہ ہو، وہ کامل یکسوئی کے ساتھ مقصدِ اعلیٰ کے لیے اپنی سرگرمی کو جاری رکھ سکے۔

اعتدال کا طریقہ

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہتر عمل بیچ کا عمل ہے (خیر الامور اوسطہا) حضرت علیؓ کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے کہ تم درمیانی طریقہ اختیار کرو (علیکم بالنمط الاوسط) تفسیر قرطبی ۲/۱۵۴

بیچ کے عمل سے مراد اعتدال کا عمل ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن کی اس آیت میں ہے کہ خرچ کرنے کے معاملہ میں تم نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ (بنی اسرائیل ۲۹) اسی بات کو دوسری جگہ اس طرح فرمایا کہ اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں، اور ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے (الفرقان ۶۷)

اس آیت کے مطابق، انفاق اوسط یہ ہے کہ نہ بہت زیادہ نہ بہت کم۔ بلکہ درمیانی مقدار جس کو آسانی کے ساتھ آدمی اختیار کر سکے ـــــ اسی طرح نفل روزے، نفل نمازوں وغیرہ میں بھی یہ مطلوب ہے کہ آدمی بیچ کا راستہ اختیار کرے جس کو وہ دیر تک نباہ سکتا ہو۔

اس معتدل انداز کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ ہر معاملہ میں آدمی کو افراط اور تفریط سے بچنا ہے۔ ہر معاملہ میں دو انتہاؤں کے درمیان بین بین والی صورت اختیار کرنا ہے۔ یہی طریقہ دینی مزاج کے مطابق ہے اور اسی میں کامیابی ہے۔

یہ درمیانی طریقہ دوسرے لفظوں میں غیر جذباتی طریقہ ہے۔ کوئی صورت حال پیش آنے پر جب آدمی بے قابو ہو جائے تو وہ اعتدال پر نہیں رہتا، بلکہ ایک انتہا یا دوسری انتہا کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن جب آدمی اپنے جذبات کو قابو میں رکھے تو وہ سوچ کر اپنی کارروائی کا رخ متعین کرے گا۔ اور سوچ سمجھ کر کیا ہوا عمل معتدل عمل ہی ہوتا ہے۔ غیر معتدل آدمی دوستی میں بھی حد سے گزر جائے گا اور دشمنی میں بھی حد سے باہر چلا جائے گا۔ وہ کبھی ضرورت سے زیادہ پر امید ہو جائے گا اور کبھی ضرورت سے زیادہ مایوس۔ وہ غیر ضروری طور پر کسی کو بہت اچھا سمجھ لے گا اور کسی کو بہت زیادہ برا ـــــ لیکن قدرت کا فیصلہ ہے کہ اس دنیا میں معتدل آدمی کامیاب ہو اور غیر معتدل آدمی ہمیشہ ناکام۔

نماز باجماعت

عن عبدِ اللہ بن عمرَ اَنَّ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : صلاۃ الجماعۃ تفضُلُ صلاۃَ الفذِّ بسبع وعشرین درجۃً

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جماعت کے ساتھ نماز تنہا نماز کے مقابلہ میں ۲۷ درجہ افضل ہے۔

(موطا الامام مالک ۹۳)

نماز کی مطلوب کیفیات جماعت کی نماز میں بڑھ جاتی ہیں۔ اس لئے اس کا ثواب بھی اللہ کے یہاں تنہا نماز کے مقابلہ میں زیادہ ہو جاتا ہے۔

جماعت کی نماز کے لئے آدمی کو پہلے سے سوچنا پڑتا ہے کہ اب وقت آگیا ہے۔ اب مجھ کو مسجد چلنا چاہئے۔ اس طرح نمازی کا ذہن پیشگی طور پر عبادت کی سوچ میں لگ جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے گھر سے نکل کر مسجد کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ ہر قدم اس کو یاد دلاتا ہے کہ تم خدا کی عبادت کے لئے جارہے ہو۔ اس طرح گویا وہ نماز سے پہلے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے۔

مسجد میں اس کو نماز کا پورا ماحول ملتا ہے۔ یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ میں اکیلا نمازی نہیں ہوں۔ بلکہ میں ایک وسیع نمازی برادری میں شامل ہوں۔ پہلے اس کی حیثیت اگر صرف نماز پڑھنے والے کی تھی تو اب اس کی حیثیت نماز قائم کرنے والے کی بن جاتی ہے۔

پھر جماعت کی نماز خود اپنے اندر عظیم ثواب رکھتی ہے۔ اکیلے کی نماز میں گویا کہ وہ اپنا امام آپ تھا۔ یہاں اس نے دوسرے کی امامت میں نماز ادا کر کے مزید تواضع اور خشوع کا ثبوت دیا۔ اکیلے کی نماز میں اس نے اپنے انفرادی اسلام کا احساس تازہ کیا تھا۔ جماعت کی نماز میں اس نے دوسرے ہم مذہبوں کے ساتھ اجتماعی اسلام کا زندہ تجربہ کیا۔ اکیلے کی نماز میں اس نے ایک فرد کی سطح پر فیضان خداوندی کو پایا تھا، جماعت کی نماز میں وہ پورے مجموعہ پر اترنے والے فیضان خداوندی میں شریک ہو گیا۔

اسی کے ساتھ جماعت کی نماز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آدمی مسجد کے مقدس ماحول میں اپنے دوسرے بھائیوں سے جڑ جاتا ہے۔ وہ ان سے سیکھتا بھی ہے اور ان کو سکھاتا بھی ہے۔ وہ ان سے پاتا بھی ہے اور انھیں دیتا بھی ہے۔ اکیلے کی نماز میں اس نے اگر صرف نماز ادا کی تھی تو جماعت کی نماز میں وہ پورے اسلام کو ادا کرنے والا بن جاتا ہے۔

تہجد کی حقیقت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ : ومن اللیل فتهجد به نافلة لك. یعنی رات کو تہجد پڑھو، یہ نفل ہے تمہارے لئے (الاسراء ۷۹) عربی زبان میں نافلہ کے معنی زائد کے ہوتے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ نافلۃ وہ ہے جو اصل سے زائد ہو (والنافلة ما كان زيادة على الاصل) لسان العرب ۱۱/۱۷۶

اس اعتبار سے نافلۃ لک کا مطلب ہوگا زائدۃ لک۔ یعنی تہجد کی نماز تمہارے لئے پانچ نمازوں پر زائد ہے۔ روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے پانچ نمازوں کو اپنے بندوں کے اوپر فرض قرار دیا ہے (خمس صلوات فرضهن الله على العباد) اور تہجد کی نماز کی حیثیت زائد نماز کی ہے۔

یہ انسان کی ایک فطری خواہش ہے کہ جس سے اس کو قلبی لگاؤ ہو اس کے معاملہ میں وہ مقرر فرائض سے بڑھ کر کچھ کرنا چاہتا ہے۔ تہجد کی نماز بندہ کی اسی خواہش کی تکمیل کے لئے ہے۔ عمومی طور پر اس صلاۃ زائد کا بہترین وقت رات کا آخری پہر ہے۔ اس وقت آدمی ایک نیند لیکر تروتازہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ان پرسکون لمحات کو کچھ دیر کے لئے خدا کی یاد میں گزارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ فجر سے پہلے چند رکعت نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

مگر بعض انسانوں کے احوال کے اعتبار سے اس صلاۃ زائد کے لئے دوسرے اوقات بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص رات کو دیر میں سویا۔ اس کی نیند دیر میں کھلی۔ اس نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے غسل کیا۔ اب وہ اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرنے لگا۔ ایسے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی صلاۃ زائد کو اپنے ان پرسکون لمحات میں ادا کرے۔

زائد کا یہ اصول ہر معاملہ میں ہے۔ تجدید کلمہ گویا شہادت زائد ہے۔ تہجد اسی طرح صلاۃ زائد ہے۔ نفل روزہ صوم زائد ہے۔ انفاق عام کی حیثیت زکاۃ زائد کی ہے۔ عمرہ گویا حج زائد ہے۔ یہی معاملہ تمام اسلامی اخلاق اور اسلامی اعمال کا ہے۔

عمل زائد میں ایک خاص لذت ہے جو عمل زائد ہی میں ملتی ہے، کسی اور طرح اس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

مسجد سے مسجد

اسلام آباد سے شائع ہونے والے عربی مجلہ الدراسات الاسلامیہ (جولائی۔ستمبر ۱۹۹۵) میں فرانس میں اسلام کے بارہ میں ایک تفصیلی رپورٹ چھپی ہے۔ اس ذیل میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کے ایک ممتاز شخص نے اسلام قبول کیا۔ ان کا موجودہ نام دانیال یوسف لوکلیک Le Cleck ہے۔ قبول اسلام کے بعد وہ جماعت تبلیغ کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے ان کی ایک جماعت کے ساتھ پیدل سفر کرکے حج کیا۔

اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ انگلینڈ سے چل کر وہ یورپ کے مختلف ملکوں سے گزرے۔ پھر وہ ترکی میں داخل ہوئے۔ پھر اردن وغیرہ ہوتے ہوئے سعودی عرب پہنچے۔ یہ لمبا سفر کس طرح طے ہوا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے رپورٹ میں یہ الفاظ ہیں کہ : مارّاً من مسجد الی مسجد (صفحہ ۱۲۶) یعنی وہ مسجدوں سے گزرتے رہے، ایک مسجد سے دوسری مسجد، دوسری سے تیسری مسجد۔ اس طرح ایک کے بعد ایک مسجدوں میں ٹھہرتے ہوئے وہ مکہ پہنچ گئے۔

یہ سادہ الفاظ ایک اہم حقیقت کو بتا رہے ہیں۔ تبلیغی جماعت کی کامیابی کا ایک خاص راز یہ ہے کہ اس نے ملت کے اندر موجود ڈھانچہ کو استعمال کیا۔ اگر وہ اپنے دینی کام کی یہ شرط رکھتے کہ پہلے دنیا کا سیاسی نظام ان کے موافق ہو جائے، اس کے بعد وہ اپنا دینی مقصد پورا کر سکیں گے تو وہ نظام حاضر سے ٹکراؤ شروع کر دیتے۔ اور اس طرح نامعلوم مدت تک کسی مثبت آغاز سے محروم رہتے۔ مگر جب انھوں نے مسجد کے موجود ڈھانچہ میں اپنا کام شروع کیا تو پہلے ہی دن ان کو نقطۂ آغاز مل گیا۔ کیوں کہ مسجدیں تو بے شمار تعداد میں ساری دنیا میں پہلے سے بنی بنائی موجود تھیں۔

اس دنیا میں کام کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے سیاسی طریقہ، اور دوسرا ہے دعوتی طریقہ۔ سیاسی طریقہ سب سے زیادہ سیاسی نظام کو بدلنے پر زور دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک جب تک سیاسی طاقت قبضہ میں نہ آئے کوئی مثبت کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے برعکس دعوتی کام موجودہ نظام کو توڑے بغیر اپنے لیے کام کا راستہ نکالتا ہے۔ اس طرح اس کو اول دن ہی سے اپنے کام کا آغاز مل جاتا ہے۔ اس کا ہر قدم آگے بڑھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔

دو طریقے

ایک قصہ ہے کہ ہوا میں اور سورج میں مقابلہ ہوا۔ ہوا نے کہا کہ میں زیادہ طاقت ور ہوں۔ سورج نے کہا کہ میں زیادہ طاقت ور ہوں۔ یہ بحث ختم نہیں ہو رہی تھی۔ پھر دونوں نے طے کیا کہ کسی معاملہ کو لے کر دونوں اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ کریں۔ پھر دونوں میں سے جو جیتے وہ زیادہ طاقت ور مانا جائے۔

صبح کا وقت تھا۔ کھلے میدان میں ایک شخص کمل اوڑھے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ دونوں نے کہا کہ آؤ، اس آدمی پر ہم اپنی طاقت کو آزمائیں۔ جو اس آدمی کا کمل ہٹا دے وہ زیادہ طاقت ور تسلیم کیا جائے گا۔

پہلے ہوا میدان میں آئی۔ اس نے تیز جھکڑ چلایا، اس نے آندھی کا طوفان برپا کر دیا۔ مگر جب آدمی نے ہوا کا طوفان دیکھا تو اس کو ڈر ہوا کہ میرا کمل کہیں اڑ نہ جائے۔ اس نے اور زیادہ اپنے کمل کو لپیٹ لیا۔ ہوا اس میں ناکام ہو گئی کہ وہ کمل کو آدمی سے جدا کر دے۔

اس کے بعد سورج نے اپنا عمل شروع کیا۔ اس نے تیزی کے بجائے آہستگی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنی کرنیں فضا میں پھیلانا شروع کیا۔ آدمی کو کسی قدر گرمی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے اپنے کمل کو ڈھیلا کر لیا۔ یہاں تک کہ جب گرمی بڑھی تو اس نے کمل اپنے جسم سے ہٹایا اور اس کو لپیٹ کر اپنی گردن پر ڈال لیا۔

یہ تمثیلی قصہ نرمی اور سختی کے فرق کو بتاتا ہے۔ معاملات میں نرمی کا طریقہ کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور سختی کا طریقہ ناکامی کی طرف۔

نرمی سے آپ کسی آدمی کے دل کو جیتتے ہیں اور سختی سے اس کو دور کر دیتے ہیں۔ کسی کے برے سلوک کو معاف کر کے آپ اس کے اندر شرمندگی کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ اس کے برعکس برائی کے جواب میں برائی یا اینٹ کے جواب میں پتھر کا طریقہ اختیار کر کے اس کے اندر ضد اور انتقام کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا (ان اللہ یعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف)

غسل اسلام میں

اسلام میں قلب و روح کی پاکی کے ساتھ جسم کی پاکی پر بھی بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پاکیزگی آدھا ایمان ہے (الطہور نصف الایمان) نماز اسلام کی اہم ترین عبادت ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ کوئی نماز جسمانی پاکی کے بغیر قبول نہیں کرتا (لا یقبل اللہ صلاۃً بغیر طہور) ہر نماز کے ساتھ وضو کو لازم قرار دیا گیا جو گویا کہ آدھا غسل ہے۔

جہاں تک مکمل جسمانی غسل کا تعلق ہے تو حدیث کی کتابوں میں طہارت کے ابواب پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب عام طور پر روزانہ غسل کرتے تھے۔ اس زمانہ میں فجر سے پہلے غسل کا عام رواج تھا۔ اس واقعہ کو حدیث کے کسی بھی مجموعہ میں کتاب الطہارۃ کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ ہر دن ایک بار غسل کرتے تھے (کان عثمان یغتسل کل یوم مرۃً) ہر روز صبح کو غسل کرنا انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ یہ فطری تقاضا یقینی طور پر اسلام میں بھی شامل ہے جو کہ حقیقی معنوں میں فطرت کا دین ہے۔

اس معاملہ میں بعض لوگوں کو ایک روایت سے اشتباہ پیش آیا ہے۔ صحیح البخاری میں روایت ہے۔ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں کہ جمعہ کے دن لوگ دور دور سے چل کر مدینہ آتے تھے۔ چنانچہ وہ غبار آلود ہوتے تھے اور ان کے جسم سے پسینہ نکل رہا ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر ان کے ایک آدمی سے کہا: لو انکم تطہّرتم لیومکم ھذا (فتح الباری ۲/۴۴۷) یعنی کاش تم اپنے آج کے دن اپنے آپ کو پاک کر لیتے۔

اس حدیث کا کوئی تعلق روزانہ غسل یا ہفتہ وار غسل سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ ہے کہ آج تم بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھو گے۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو گے۔ ایسے اجتماعی موقع کا تمہیں لحاظ کرنا چاہیے اور نہائے بغیر اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ یہ موقع کے اعتبار سے غسل کی خصوصی اہمیت کا بیان ہے نہ کہ غسل کے وقت اور میعاد کا تعین۔

شکر اور ناشکری

پانی کے ایک گلاس سے لیکر حکومتی اور سیاسی اقتدار تک جو کچھ اس دنیا میں کسی کو حاصل ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ہر چیز براہ راست اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ بھی کسی کو ملتا ہے وہ اللہ کے چاہنے سے ملتا ہے، اللہ نہ چاہے تو کچھ بھی کسی کو نہیں مل سکتا، خواہ وہ بطور خود اس کے لئے کتنا ہی زور مارے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو قرآن و حدیث سے دو اور دو چار کی طرح ثابت ہے۔

دوسری چیز جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ خدائی عطیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خصوصی عطیہ۔ اور دوسرے عمومی عطیہ۔ خصوصی عطیہ کو آجکل کی زبان میں سیاسی اقتدار کہا جاسکتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی اقتدار ہر ایک کو نہیں دیا جاتا۔ اور نہ وہ پولٹیکل تحریک یا گن کلچر چلا کر کسی کو حاصل ہوتا۔ اس کا تعلق براہ راست سنت اللہ سے ہے۔ اس سنت اللہ میں سے ایک یہ ہے کہ جو گروہ حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کا ثبوت دے اس کے لئے سیاسی اقتدار کا فیصلہ کر دیا جائے (النور ۵۵) گویا اقتدار مطلوب ہو تب بھی اس کے لئے ایمان اور عمل صالح کی تحریک چلانا ہے نہ کہ سیاسی ہنگامہ آرائی کا معرکہ جاری کرنا۔

اس کے بعد خدا کا عمومی عطیہ وہ ہے جو کم و بیش ہر ایک کے حصہ میں آتا ہے۔ یہ اصولی طور پر دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے ــــ پرامن حالات اور حصول رزق کی آسانی۔ یہ بات قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہوتی ہے:

وضرب اللہ مثلا قریۃ کانت آمنۃ مطمئنۃ یاتیہا رزقہا رغدا من کل مکان فکفرت بانعم اللہ فاذاقہا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون

(النحل ۱۱۲)

اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن اور اطمینان میں تھے۔ ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا۔ پھر انھوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو ان کے اعمال کے سبب سے بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا۔

اعتراف

سب سے بڑا عمل اعتراف ہے۔ اعتراف کی حیثیت جڑ والی صفت کی ہے۔ جس آدمی کے اندر اعتراف کا مادہ ہو، اس کے اندر دوسری تمام خوبیاں بھی موجود ہوں گی۔ جو آدمی اعتراف سے خالی ہو، وہ یقینی طور پر تمام خوبیوں سے بھی خالی ہوگا۔

یہ اعتراف کا مادہ ہی ہے جو کسی آدمی کو ایمان کی طرف لے جاتا ہے جو کہ دین کی اصل بنیاد ہے۔ جس کو شریعت کی زبان میں ایمان کہا جاتا ہے، اسی کا نام فطرت کی زبان میں اعتراف ہے۔ اعتراف کی فطرت جب ایمان میں ڈھل جائے تو وہیں سے دینی یا اسلامی زندگی شروع ہوجاتی ہے۔ اعتراف ہی کی عملی صورت کا نام عبادتِ خداوندی ہے۔

اعتراف کا مادہ ہی آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ پیغمبر کی پیغمبری کو مانے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ پیغمبر اس کے لئے قابل اطاعت نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسے اپنی پوری زندگی میں پیغمبر کے حکم کی پیروی کرنا چاہئے۔

قرآن کو خدا کی کتاب سمجھنا اور حدیث کو پیغمبرِ خدا کے کلام کا درجہ دینا بھی اسی جذبۂ اعتراف کی بنا پر ہوتا ہے۔ حقیقتِ واقعہ کے اعتراف کا جذبہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ قرآن وحدیث کی اس حیثیت کو تسلیم کرے جو فی الواقع اسے حاصل ہے۔

اسی طرح انسانوں کے حقوق کی ادائگی کا معاملہ بھی اعتراف سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دراصل جذبۂ اعتراف ہی ہے جو آدمی سے یہ کہتا ہے کہ دوسروں کا حق جو تمہارے اوپر آتا ہے اس کو تم پوری طرح ادا کرو۔ احترام، شفقت، امانت، صبر، شریفانہ اخلاق، وعدہ پورا کرنا، لوگوں کے ساتھ خیرخواہی کرنا، اس قسم کی جتنی بھی اعلیٰ انسانی خصوصیات ہیں، ان سب کا سرچشمہ اعتراف ہے

اسی طرح تمام بری صفات کا رشتہ بے اعترافی سے بندھا ہوا ہے۔ ایمان پر راضی نہ ہونا بے اعترافی ہے۔ کسی انسان کے ساتھ حسد اسی لئے پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اس کے فضل کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا۔ آدمی خیانت اسی لئے کرتا ہے کہ وہ نہیں مانتا کہ جو چیز اس کے پاس ہے وہ اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ دوسرے کی ہے۔

دعوہ ہاٹ لائن

"ہیلو، کیا کوئی صاحب وہاں ہیں جو میری بات کا جواب دیں۔ میں ایک امریکن یہودی ہوں، اور اسلام کے بارہ میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ میں نے امریکہ کی کئی مسجدوں میں ٹیلیفون کیا۔ مگر کہیں سے مجھے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ میں صرف اسلام کے بارہ میں معلومات چاہتا ہوں۔"

یہ ایک ٹیلیفون کال تھی جو اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (ICNA) کے دفتر واقع جمیکا میں موصول ہوئی۔ ٹیلیفون پر موجود شخص نے اپنی استطاعت کے مطابق جواب دیا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس طرح کی کالیں اکثر امریکہ کی مسجدوں میں موصول ہوتی ہیں۔ مگر ہر وقت مسجد میں کسی موزوں شخص کی عدم موجودگی کی وجہ سے کال کرنے والے کو صحیح اور موثر جواب نہیں مل پاتا۔ یا سرے سے وہاں کوئی شخص موجود نہیں ہوتا جو ٹیلیفون کرنے والے کو ضروری اطلاع دے۔

آخر کار یہ واقعہ مذکورہ اسلامک سنٹر (اکنا) کے دفتر میں ہاٹ لائن ٹیلیفون نصب کرنے کا محرک بن گیا۔ ۱۹۹۵ میں یہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا۔ اس کا نام دعوہ ہاٹ لائن ہوگا۔ اور اس کا نمبر اس طرح ہوگا: (1-800-662-ISLAM) اس لائن پر کوئی نہ کوئی تربیت یافتہ آدمی ہر وقت موجود رہے گا۔ اور پوچھنے والوں کو اسلام کے بارہ میں ضروری معلومات فراہم کرے گا۔ فی الحال اس مقصد کے لئے مذکورہ مرکز نے دو ہمہ وقتی کارکنوں کی خدمات حاصل کی ہیں جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ انھوں نے اسلام کا اچھا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس منصوبہ کا ابتدائی خرچ ایک لاکھ ڈالر (۳۰ لاکھ روپیہ) ہے (دعوت، ۱۳ جولائی ۱۹۹۵)

قدیم زمانہ میں داعی کو مدعو کے پاس جانا پڑتا تھا۔ اب موجودہ زمانہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ مدعو خود داعی کے پاس پہنچ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیا بھر کے شہری مراکز میں ایسے انتظامات کئے جائیں جہاں سے لوگ ٹیلیفون پر اسلام کے بارہ میں معلومات حاصل کر سکیں۔ ہندستان کے بڑے شہروں میں بھی اس کی سخت ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو غیر مسلموں کے اعلی طبقہ میں اسلام کا پیغام پہنچنے لگے۔

ایک واقعہ

مسٹر عبد المجیط خاں (ریٹائرڈ جوائنٹ ڈائرکٹر) آجکل فیض آباد میں رہتے ہیں۔ ۲۸ جون ۱۹۹۵ کی ملاقات میں انھوں نے اپنی سروس کے زمانہ کے کئی سبق آموز تجربات بتائے۔ ان میں سے ایک تجربہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مسٹر اے ایم خان نے ۱۹۵۵ میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے الکٹریکل انجینئرنگ میں بی ای کی ڈگری لی۔ ۱۹۶۳ میں چندولی (ضلع بنارس) کے پرائیویٹ پالی ٹکنیک میں ایک جگہ خالی ہوئی۔ یہ سنیئر لکچرر کی جگہ تھی۔ اسی کے ساتھ کامیاب امیدوار کو الیکٹریکل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کا عہدہ بھی سنبھالنا تھا۔

اس کا انٹرویو بنارس کے کمشنر جے بی ٹنڈن کی سرکاری رہائش گاہ پر تھا۔ کمشنر صاحب چندولی پالی ٹکنیک میں بحیثیت عہدہ اس کی نیجنگ کمیٹی کے صدر بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی انٹرویو میں شریک تھے۔ انٹرویو بورڈ کے ایک رکن پروفیسر رام سرن تھے۔ دوسرے رکن پروفیسر گیرولا تھے۔ پروفیسر گیرولا بنارس ہندو یونیورسٹی میں مسٹر خان کے استاد رہ چکے تھے۔

پروفیسر رام سرن نے مسٹر خان سے سوال کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ انسٹرومنٹ ٹرانسفارمر کیا ہوتا ہے:

Mr. Khan, do you know what is instrument transformer?

مسٹر خان نے ابھی سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ پروفیسر گیرولا نے کمشنر ٹنڈن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ سب سے بہتر امیدوار ہیں۔ ان کے لئے انٹرویو دینے کا کوئی سوال نہیں:

He is the best candidate. There is no question of interview.

اس کے بعد انھوں نے اے ایم خان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر خان، آپ جا سکتے ہیں:

Mr. Khan, you can go.

پروفیسر سرن جنھوں نے سوال کیا تھا وہ خاموش رہے۔ مسٹر خان اپنے کاغذات لے کر کمرہ سے باہر آ گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد ان کو حسب قاعدہ اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا۔ وہ چندولی پالی ٹکنیک میں سنیئر لکچرر

مع ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ الکٹریکل انجنیرنگ مقرر ہوگئے۔ اس کے بعد ان کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ جوائنٹ ڈائرکٹر (ٹکنکل ایجوکیشن) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

آجکل اکثر نوجوان یہ کہتے ہوئے ملیں گے کہ روزگار نہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قابل روزگار افراد نہیں۔ مسٹر اے ایم خان کے ساتھ مذکورہ واقعہ اسی لئے پیش آیا کہ انھوں نے محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ تعلیم کے دوران ان کا کردار نہایت عمدہ رہا۔ پروفیسر گیروالا اور دوسرے متعلق لوگوں کے درمیان ان کی تصویر نہایت عمدہ بنی۔ اسی کی وہ قیمت تھی جو مذکورہ شاندار واقعہ کی صورت میں انھیں ملی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر ادارہ اور ہر دفتر اچھے کارکنوں کو چاہتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کا کام درست طور پر نہیں چل سکتا۔ کوئی بھی آدمی اپنا دشمن نہیں، اس لئے کوئی بھی آدمی اچھے کارکن کو نظر انداز کرنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اچھا اور قابل اعتماد کارکن دوسروں کی ضرورت ہے۔ آپ دوسروں کی ضرورت بن جائیے، اور پھر آپ کے لئے روزگار حاصل کرنا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔

اس دنیا کا نظام دو طرفہ لین دین پر چل رہا ہے۔ یہاں شکایت اور احتجاج اور مطالبہ کی کوئی قیمت نہیں۔ اس دنیا کا سادہ اصول یہ ہے کہ —— جتنا دینا اتنا پانا۔ اگر آپ روزگار حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو دوسروں کے لئے مفید بنائیے۔ اپنے اندر وہ مہارت پیدا کیجئے جس کی دوسروں کو ضرورت ہے۔ اور پھر آپ کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے آپ کو روزگار تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد روزگار خود آپ کو تلاش کرے گا۔ حتی کہ یہ حال ہو جائے گا کہ آپ آگے ہوں گے اور روزگار آپ کے پیچھے۔

استقلال میں کامیابی

" استقلال میں کامیابی ہے۔" کسی کا یہ قول نہایت بامعنی طور پر کامیابی کی حقیقت کو بتاتا ہے۔ اور پوری تاریخ اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ زندگی ہمیشہ ناہموار راستوں میں طے ہوتی ہے۔ یہاں ہر آدمی کو طرح طرح کے ناموافق حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس لئے زندگی میں ہمیشہ یہ کرنا پڑتا ہے کہ ناموافق تجربات کے باوجود آدمی اپنا سفر برابر جاری رکھے۔ اسی کا نام استقلال ہے۔ اور جو آدمی استقلال کا ثبوت دے وہی اس دنیا میں کامیابی کی منزل کو پہنچتا ہے۔ جتنا استقلال اتنی ہی کامیابی۔

یہ فطرت کا قانون ہے اور اگر آدمی آنکھ کھول کر دیکھے تو ہر طرف اس کو ایسے نشانات نظر آئیں گے جو اس کو اس حقیقت کا پتہ دے رہے ہوں۔ جو اس کو اس حقیقت کی یاددہانی کرانے والے ہوں۔

ایک آدمی دریا کے کنارے ایک چٹان پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا تو اس کو نظر آیا کہ پانی کی موجوں کے مسلسل ٹکرانے سے چٹان کا پتھر گھس گیا ہے۔ اس نے کہا کہ دیکھو، چٹان ایک سخت چیز ہے اور پانی ایک نرم چیز ہے۔ لیکن اگر نرم چیز بھی استقلال کے ساتھ عمل کرے تو وہ چٹان جیسی سخت چیز کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ ساری دنیا میں سمندروں کے کنارے بے شمار مقدار میں ریت کے جو ذرے پائے جاتے ہیں وہ ساحلی چٹانوں کے ساتھ پانی کے اسی ٹکراؤ کے ذریعہ وجود میں آئے ہیں۔

مولانا اسماعیل میرٹھی ایک ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے بہت سی اصلاحی نظمیں لکھی ہیں۔ استقلال کی اس اہمیت کو انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے :

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل   تو گھس جائے بے شبہہ پتھر کی سل

اس معاملہ کی ایک تازہ مثال ڈاکٹر سبرامنیم چندر شیکھر (۱۹۹۵ - ۱۹۱۰) کا واقعہ ہے۔ وہ بچپن سے ریاضی اور فلکیات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر ریسرچ شروع کی کہ ستارے کس طرح وجود میں آتے ہیں۔ اور کس طرح فنا ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی تحقیقات کے

ابتدائی نتیجہ کو ایک مقالہ کی صورت میں مرتب کیا اور پہلی بار ۱۱ جنوری ۱۹۳۵ کو لندن میں ہونے والی ایسٹروفیزیکل سوسائٹی کی ایک میٹنگ میں یہ مقالہ پیش کیا۔ اس میٹنگ میں برطانیہ کے بڑے بڑے سائنس داں موجود تھے۔ ڈاکٹر سبرامنیم چندرشیکھر جب اپنا مقالہ پیش کر چکے تو اس وقت کے ایک ممتاز برطانی سائنس داں سر آرتھر ایڈنگٹن اٹھے۔ انھوں نے نوجوان چندرشیکھر کا مذاق اڑایا اور ان کا مقالہ سب کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیا۔

اس کے بعد چندرشیکھر نے چاہا کہ اپنا یہ مقالہ لندن کے ایسٹروفیزیکل جرنل میں چھپوائیں۔ مگر اس سائنسی جرنل نے بھی ان کا مقالہ چھاپنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر چندرشیکھر برطانیہ میں پیش آنے والے اس حوصلہ شکن تجربہ سے بد دل ہو کر اپنے وطن ہندستان واپس آئے اور یہاں یونیورسٹیوں میں ملازمت کی تلاش کی مگر یہاں اپنے وطن میں بھی انھیں کسی یونیورسٹی میں ملازمت نہ مل سکی۔ وطن کے باہر بھی انھیں ٹھکرا دیا گیا اور وطن کے اندر بھی۔

لیکن چندرشیکھر مایوس نہیں ہوئے۔ اس کے بعد وہ شکاگو (امریکہ) چلے گئے۔ وہاں انھیں حالات سازگار ملے۔ مگر وہ اپنی تحقیقات میں ازسرنو مشغول ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کا نظریہ مقبول ہونے لگا۔ ان کے مقالات بڑے بڑے سائنسی مجلات میں چھپنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کا نظریہ چندرشیکھر لمٹ (Chandra Shekhar Limit) کے نام سے سائنسی دنیا میں تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۸۳ میں جب کہ ڈاکٹر چندرشیکھر کی عمر ۷۳ سال ہو چکی تھی ان کو سائنس کا نوبل پرائز دیا گیا۔

اس طرح کے سبق آموز واقعات سے انسانی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ اس دنیا میں جس شخص نے بھی کوئی حقیقی کامیابی حاصل کی ہے اسی استقلال اور مسلسل عمل کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں۔

کسی مفکر کا قول ہے کہ اگر تم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر انتظار کی طاقت پیدا کرو۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ کامیابی ہمیشہ لمبے انتظار کے بعد ملتی ہے۔ اور انتظار کی ضرورت اسی لئے ہے کہ کوشش کے دوران ہر بار ایسی رکاوٹیں پیش آتی ہیں جو بظاہر منزل کو دور کر دیتی ہیں۔ اس لئے آدمی کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہمت نہ ہارے۔ وہ صبر و برداشت سے کام لیتے ہوئے اپنی کوشش میں لگا رہے۔ وہ انتظار کی مدت کو کبھی ختم نہ ہونے دے۔

یہ معاملہ اتنا قطعی ہے کہ اس میں ہمارے لئے کوئی دوسرا انتخاب نہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ فطرت کے اس فیصلہ کو مانیں۔ ہم فطرت کے نظام سے مطابقت کرتے ہوئے ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ فطرت کے مقرر نظام کو بدلنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی نہ شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع کرے۔ اور نہ مایوس اور پست ہمت ہو۔ وہ حقیقت پسندی کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنا عمل مسلسل جاری رکھے۔ اس کے بعد کامیابی اس کے لئے اتنی ہی یقینی ہو جائے گی جتنا کہ شام کو سورج ڈوبنے کے بعد اگلی صبح کو دوبارہ روشن سورج کا نکلنا۔ مسلسل عمل لازمی طور پر آدمی کو اس کے مطلوب نتیجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

قدرت کو ککڑی کا درخت اگانے کے لئے صرف چند مہینے درکار ہوتے ہیں۔ مگر جب چنار کا درخت اگانا ہو تو اس میں خود قدرت کو بھی سو سال کا وقت لگ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کا معاملہ اس سے مستثنیٰ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

اگر آپ لمبی محنت کے اصول کو نہ مانیں تو پھر آپ کو اس پر راضی ہونا پڑے گا کہ آپ اپنی زندگی میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ کیوں کہ لمبی مدت تک مستقل محنت ہی کسی بڑی کامیابی کی لازمی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت دینے کے لئے تیار نہ ہو اس کو اپنے لئے کسی بڑی کامیابی کی امید بھی نہ کرنا چاہئے۔ (نوٹ: یہ تقریر ۲۸ ستمبر ۱۹۹۵ کو آل انڈیا نئی دہلی سے نشر کی گئی)

۲۸ ستمبر کو وگن سے برمنگھم کے لئے روانگی ہوئی۔ دوپہر کے وقت جب ہماری گاڑی برمنگھم میں داخل ہوئی تو سڑک کے عین کنارے مسجد کا منظر دکھائی دیا۔ ساتھیوں نے بتایا کہ یہ یہاں کی گرینڈ ماسک ہے۔ اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے بیرونی سمت میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسری طرف جلی حرفوں میں انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: قرآن پڑھئے، آخری عہد نامہ:

Read AL-QURAN THE LAST TESTAMENT

برمنگھم میں میرا قیام جناب شمشاد خاں صاحب کے یہاں تھا۔ وہ مکمل طور پر دعوتی مزاج کے آدمی ہیں۔ اپنی پوری زندگی دعوہ ورک کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ وہ دعوت کے کام کا موقع نکال لیتے ہیں۔ برمنگھم میں وہ اپنا نیا مکان بنوا رہے تھے۔ مختلف قسم کے کاریگر اس میں لگے ہوئے تھے جو سب کے سب مسیحی تھے۔ ایک روز انھوں نے ان مسیحی کاریگروں سے کہا: دیکھو، تمہاری کلیسا جی نے تم کو کیسا بیوقوف بنا رکھا ہے۔ اس براہ راست جملہ پر وہ لوگ چونکے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ شمشاد خاں صاحب نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر میں ایک قتل کروں اور اس کی سزا تم کو دی جائے تو کیا یہ انصاف کی بات ہوگی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ شمشاد خاں صاحب نے کہا کہ پھر دیکھو، تمہاری کلیسا جی کا کہنا ہے کہ مسیح کو گناہ کے کفارہ کے لئے صلیب پر چڑھا یا گیا۔ یعنی گناہ تو دوسرے انسانوں نے کیا اور اس کی سزا حضرت مسیح کے اوپر ڈال دی گئی۔ کیا یہ انصاف ہے اور کیا ایسا کہہ کر کلیسا جی تم کو بے وقوف نہیں بنا رہی ہے۔ ان لوگوں نے فوراً کہا: مسٹر خان، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں (Mr. Khan, you are right.)

چند سو سال پہلے مذہبی موضوعات پر اس طرح آزادانہ گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ جدید فکری انقلاب کا کرشمہ ہے جس نے اس طرح آزادانہ انداز میں مذہب پر تبادلۂ خیال کا موقع دے دیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے ساری دنیا میں قومی جھگڑوں کی جو سیاست چلا رکھی ہے وہ اس فضا کو درہم برہم کر رہی ہے۔

برمنگھم کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ کچھ لوگ میرے بارہ میں یہ پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ میرے اندر بڑائی کا احساس ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہوں۔ حالاں کہ یہ سراسر الٹی

بات ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اتنا زیادہ عاجز سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنا وجود بالکل بے معنی نظر آتا ہے۔ شعر و شاعری مجھے پسند نہیں۔ مگر اپنی تنہائیوں میں اکثر فارسی کا یہ شعر میری زبان پر آجاتا ہے:

نہ گلے نہ برگ سبزے نہ ثمر نہ سایہ دارم　　در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

برمنگھم کے اردو ماہنامہ "صراط مستقیم" کے شمارہ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۳ میں ایک رپورٹ دیکھی۔ یہ برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کے بارہ میں تھی۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ یہ تھا:

"یہاں شادیوں کے لئے بڑے بڑے ہال بک کرائے جاتے ہیں، چھ ماہ پہلے ہی بُک کرانے کے لئے تگ و دو شروع ہو جاتی ہے۔ شادی کے دن عورتیں، بڑے زرق برق لباس پہن کر آتی ہیں۔ آدمی خوب اپنی عورتوں، بہنوں اور بچیوں کو ہار سنگار کرا کر میک اپ لگا کر لاتے ہیں، جیسے انھیں کسی منڈی میں لے جا رہے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خوب بن ٹھن کر آتے ہیں۔ مختلف ٹولیوں میں ایک دوسرے کی تصاویر کھینچتے ہیں اور مختلف پوز بناتے ہیں۔ ویڈیو فلمیں بھی خوب بنائی جاتی ہیں۔ جہاں نوجوان فیشن پرست لڑکیاں دیکھیں ان پر کیمرے خوب چلتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یاد کے لئے رکھتے ہیں۔ حقیقت میں بے حیائی اور بے غیرتی کو تحفظ دینا مقصود ہوتا ہے۔ گھر کے اندر نوجوان بیٹھ کر شادی کی فلمیں دیکھتے ہیں، پھر لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں، ان سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

برمنگھم میں ان دنوں کافی سردی تھی۔ یہاں کے موسم کے مطابق اکثر ہلکی بارش ہوتی رہتی تھی۔ رات کو میں اپنے بستر پر لیٹا تو جناب شمشاد محمد خاں صاحب نے گرم پانی کی تھیلی (Hotwater bottle) لا کر دی اور کہا کہ اس کو بستر میں رکھ لیں۔ پہلے میں نے خیال کیا تھا کہ شاید موجودہ لحاف کے ساتھ مجھے ایک کمبل کا اضافہ کرنا پڑے۔ لیکن گرم پانی کی تھیلی بالکل کافی ہو گئی اور بستر اچھی طرح گرم ہو گیا۔

یہ طریقہ مجھے معلوم نہ تھا۔ مگر اس تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سخت سردیوں میں بستر کو گرم کرنے کا نہایت آسان اور سستا طریقہ ہے۔ کشمیر کے لوگ رات کو بستر میں کانگڑی رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گرم پانی کی تھیلی اس کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہے اور بے ضرر بھی۔

کراچی سے ایک اردو ماہنامہ الفاروق شائع ہوتا ہے۔ اس کا شمارہ محرم۔ صفر ۱۴۱۴ھ دیکھا۔ اس میں ایک مسلمان مقیم برطانیہ (برنلے) کا مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا: برطانیہ کی روز افزوں تباہی کے دو اہم اسباب، سودی قرض اور کتوں کی کثرت۔ برطانیہ کے نفرت انگیز تعارف کے بعد آخر میں مضمون اس جملہ پر ختم ہوا تھا: اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مسلمانوں کو اس بلا سے محفوظ رکھے۔ اللّٰھم حفظنا منہ، آمین (صفحہ ۲۸)

میں نے برطانیہ کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ میں نے پایا کہ یہاں بھی مسلمان اسی طرح "کافروں اور مشرکوں" اور یہود ونصاریٰ کے خلاف بد دعا کرنے میں مشغول ہیں جس طرح ہندستان میں دکھائی دیتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہتے ہیں اس سے نہ تو ان کو وطنی محبت ہے اور نہ ان ممالک کے باشندوں کے حق میں ان کی زبان سے دعائیہ کلمات نکلتے ہیں۔ ان کے یہاں صرف اپنی قوم کے لئے دعائیں ہیں۔ انھیں شاید معلوم نہیں کہ جو لوگ دوسروں کے حق میں نیک دعائیں نہ کرسکیں ان کی نیک دعائیں خود اپنے حق میں بھی قبول نہیں ہوتیں۔

مذکورہ رسالہ میں "تبلیغی جماعت" کے بارہ میں ایک مضمون تھا۔ اس کے آخر میں امت کو دعوت کی محنت پر ڈالنے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ دعا کی گئی تھی: اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اپنے دین کے لئے قبول فرمائے (صفحہ ۸) رسالہ کی اشاعت کے نویں سال پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ: اللہ تعالیٰ ہمیں امت مسلمہ کی مزید خدمت کی توفیق نصیب فرمائے، آمین (صفحہ ۳)

اس قسم کی باتوں کو جب میں سنتا ہوں یا پڑھتا ہوں تو میرے دل سے ایک آہ نکلتی ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ مسلمانوں نے اسلام کو اپنا قومی افتخار بنالیا ہے۔ اور جو مذہب قومی افتخار بن جائے وہ نہ خدا کو مطلوب ہوتا ہے اور نہ خلق کو۔

مسٹر پرویز عالم (علیگ) بی بی سی میں ہندی سکشن کے پروڈیوسر ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے برٹش سوسائٹی کے بارہ میں کئی باتیں بتائیں۔

انھوں نے کہا کہ سلمان رشدی کے خلاف جب مسلم دنیا میں تحریک چل رہی تھی تو

یہاں کے مسلمانوں نے بھی اس کے خلاف جلوس نکالا۔ اس کو تمام انگریزوں نے ٹی وی پر دیکھا۔ اس میں انھوں نے دیکھا کہ مسلمان لکڑی میں باندھ کر سلمان رشدی کی کتاب اٹھا رہے ہیں۔ اس میں آگ لگاتے ہیں۔ پھر اس کو زمین پر گرا کر اس کو پیروں کے نیچے روندتے ہیں۔ چیختے چلاتے اور نعرہ لگاتے ہیں۔ وغیرہ۔

اس قسم کے مناظر تمام انگریزوں نے ٹی وی پر دیکھا تو لوگوں کے درمیان مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ وہ سمجھنے لگے کہ یہ کوئی وحشیانہ مذہب ہے۔ اب بھی جب کوئی اسلام یا مسلمان کی بات آتی ہے تو اس کے ساتھ بار بار وہ مناظر سامنے لائے جاتے ہیں۔ کبھی انگریز دیکھتا ہے کہ مسلمان اچھل اچھل کر جلتی ہوئی کتاب کو پیروں کے نیچے روند رہے ہیں۔ کبھی لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک داڑھی والا مسلمان قصائی ہاتھ میں چھری لئے ہوئے ہے اور کہہ رہا ہے : میں تم کو مار ڈالوں گا (I will kill him.)

میں نے یہاں کے ایک مسلمان سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ کچھ مسلمانوں نے کیا تھا نہ کہ سارے مسلمانوں نے۔ میں نے کہا کہ بقیہ مسلمانوں نے اس کے خلاف مذمتی بیان کیوں نہیں دیا۔ اور جب بقیہ مسلمانوں نے اس کی مذمت نہیں کی تو اسلام کی رو سے وہ بھی اس مجرمانہ فعل میں شریک ہیں۔ حدیث کی زبان میں وہ گونگے شیطان ہیں۔

ناگپور کے ایک ادارہ انڈیا پیس سنٹر (India Peace Centre) نے گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) اور انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز (واردھا) کے تعاون سے نومبر ۱۹۹۳ میں ایک چھ روزہ اسٹڈی کیمپ منعقد کیا۔ اس اسٹڈی کیمپ میں ملک کے تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کی تھیم تھی ــــــ قومی دھارا اور اقلیت :

Minorities in India and the national mainstream.

اس کے منتظمین کی طرف سے مجھے دعوت نامہ ملا تھا کہ میں ۶ نومبر کو اس کے آخری اجلاس میں اختتامی خطاب (Valedictory address) پیش کروں۔ اس کے لئے مجھے ایک گھنٹہ کا وقت دیا گیا تھا۔ سفر سے پہلے دہلی میں میں نے ایک پیپر لکھنا شروع کیا۔ مگر محسوس ہوا کہ یہ موضوع بے حد مشکل ہے۔ کوشش کے باوجود پیپر تیار نہ ہوسکا۔ برمنگھم میں جب کہ میں جناب شمشاد محمد خاں صاحب

کے مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اچانک ایک روز صبح کو محسوس ہوا کہ پورا مضمون بیک وقت ذہن میں اتر آیا ہے۔ میں قلم کاغذ لے کر بیٹھا اور اسی وقت اس کو لکھ ڈالا۔ یہ مضمون برمنگھم میں ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ کی شام کو مکمل ہوا۔ یہ مقالہ الرسالہ اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔

احمدیہ موومنٹ (قائم شدہ ۱۸۸۹) کا ایک انگریزی ماہنامہ لندن سے نکلتا ہے۔ اس کا نام ہے: (The Review of Religions) اس ماہنامہ کے شمارہ جولائی ۱۹۹۳ میں پادری جوناتھن ڈریپر (Rev. Dr. Jonathan Draper) کی ایک تقریر چھپی تھی جو انھوں نے لندن مسجد (London Mosque) میں یکم مئی ۱۹۹۳ کو کی تھی۔

اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ کھلا پن (Openness) اینگلیکن ٹریڈیشن کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انھوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ آپ لوگ یہاں عیسائیت کے بارہ میں میری تقریر سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اسی طرح میں امید کرتا ہوں کہ آپ میرے چرچ میں آئیں اور ہم کو اسلام کے سمجھنے میں مدد دیں:

> But in the same way that you are now spending time learning about Christianity in its various forms, I hope that one day soon some of you will come to my church to help us learn something of Islam. (p. 18)

یہ زمانہ آزادانہ طور پر سننے اور سنانے کا زمانہ ہے۔ اس کو ہمیں پوری طرح استعمال کرنا چاہئے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم دوسروں کے اجتماعات میں شریک ہو کر سنجیدگی کے ساتھ ان کی بات سنیں۔ اس طرح تعلق بڑھانے کی صورت میں اپنے آپ مختلف صورتوں میں یہ مواقع نکلیں گے کہ ہم اسلام کی بات دوسروں تک پہنچا سکیں۔ حتی کہ دوسرے لوگ خود اپنے اجتماعات میں ہمیں بلائیں گے کہ آئیے اور ہمیں بتائیے کہ اسلام کیا ہے۔ جیسا کہ اسی سفر میں میرے ساتھ اٹلی میں پیش آیا۔ مگر اس جدید امکان کو استعمال کرنے کے لئے دو چیزوں کی لازمی ضرورت ہے ــــ صبر اور حکمت۔

ریاض عبد السلام احمد ایک عرب نوجوان ہیں جو انگلستان میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ خلیجی جنگ کے بعد ۱۹۹۱ میں لندن میں مصر کے شیخ عمر عبد الرحمن آئے۔ ان کا ایک

ویڈیو ٹیپ میں نے دیکھا۔ اس کے مطابق، مجلس میں انھوں نے کہا کہ کافروں کے ساتھ ہمارا تعلق صرف قتل اور جنگ کا ہے۔ ایک مسیحی نے کھڑے ہو کر کہا کہ یا شیخ، آپ کیوں صرف قتال کی آیتیں قرآن سے لیتے ہیں اور عفو اور نرمی اور محبت کی آیتوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ شیخ عمر عبد الرحمٰن تردد میں پڑ گئے اور کہا کہ کافروں کے ساتھ معاملہ کے لئے ہمارا طریقہ یہی ہے:

قال الشیخ عمر عبد الرحمٰن: علاقاتنا مع الکافرین القتل وغیرھا من اسالیب العنف۔ فقام رجل مسیحی وقال یا شیخ انا ممن تعدونھم کافرین ولکن یا شیخ، لما تذھب الیٰ آیات القتال و تعرض عن آیات العفو و التسامح و الحب۔ فارتبك الشیخ وقال۔ ھٰذا منھجنا فی التعامل مع الکافرین۔

ایک مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم دانشور اس اعلان میں مشغول ہیں کہ موجودہ زمانہ ایک اسلام دشمن زمانہ ہے۔ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے، اسی لئے وہ اسرائیل کی سرپرستی کر رہا ہے۔ برطانیہ اسلام کا پشتینی دشمن ہے، اسی لئے وہ سلمان رشدی کو پناہ دئے ہوئے ہے۔ مگر عین اسی وقت مسلمان بہت بڑی تعداد میں ان ملکوں میں آکر آرام کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں چھ ملین مسلمان آباد ہیں اور برطانیہ میں دو ملین مسلمان۔

ذاتی معاملہ اور ملی معاملہ میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمان اپنی ذات کے لئے مواقع کو دیکھتے ہیں اور اسلام کے لئے مسائل کو۔ ذات کے معاملہ میں وہ مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو کی پالیسی کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور جب اسلام کا معاملہ ہو تو فوراً مسائل کو لے کر دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنی ذات کے معاملہ میں وہ مسٹر نو پرابلم بنے ہوئے ہیں اور اسلام کا معاملہ ہو تو وہ فوراً مسٹر پرابلم بن جاتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہی تضاد موجودہ زمانہ میں تمام ملی مصیبتوں کا اصل سبب ہے۔ ذات کے معاملہ میں انھوں نے فطرت کے اصول کو اختیار کیا اس لئے ذات کے معاملہ میں وہ کامیاب ہیں۔ اسلام کے معاملہ میں وہ فطرت کے اصول کو اختیار نہ کر سکے اس لئے انفرادی ترقی کے باوجود بحیثیت ملت انھیں ترقی حاصل نہ ہو سکی۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بنو آدم کو زمین پر بسانے کا ارادہ کیا تو فرشتوں نے کہا : أتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفك الدماء و نحن نسبح بحمدك و نقدس لك ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کو آزاد مخلوق کی حیثیت سے زمین پر بسایا جانے والا تھا ۔ اور فرشتے جانتے تھے کہ آزاد مخلوق لازماً اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے گی اور زمین پر فساد برپا کرے گی ۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس شبہہ کی تردید نہیں کی ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کا شبہہ درست تھا اور بعد کی تاریخ میں وہ عملی طور پر درست ثابت ہو گیا ۔

اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اس بات کو قبول نہیں کیا کہ نحن نسبح بحمدک و نقدس لک ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے اضطراری حامد اور اضطراری مسبح تھے ۔ اب خدا کو ایسی مخلوق درکار تھی جو اختیاری حامد اور اختیاری مسبح ہو ۔ پوری تاریخ اگر فسادیوں سے بھر جائے اور صرف تھوڑے سے مطلوب انسان مل سکیں تب بھی وہ اس قابل تھا کہ تاریخ بشری کا یہ عظیم ہنگامہ وجود میں لایا جائے ۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دو ملین ہے ۔ ان میں سے زیادہ تر پاکستان ، انڈیا ، بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس کے بعد ترک اور عرب ہیں ۔ تقریباً دس ہزار وہ انگریز ہیں ، جنھوں نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ۔

۳۵ سال پہلے برطانیہ میں صرف دس مسجدیں تھیں ۔ مگر آج یہاں ۱۴۰۵ مسجدیں موجود ہیں برطانیہ کی پہلی مسجد ووکنگ میں ۱۸۹۰ میں بنائی گئی تھی ۔ لندن کی پہلی مسجد غالباً ۱۹۲۴ میں بنی اس کے علاوہ پورے برطانیہ میں ۲۰۰ کی تعداد میں اسلامی مرکز قائم کئے جا چکے ہیں ۔ حتی کہ یہاں روایتی انداز کا دار العلوم بھی قائم ہے ۔ جس میں طلبہ کی تعداد ۲۵۰ ہے ۔ مجموعی طور پر برطانیہ میں ایک درجن کی تعداد میں بڑے مدرسے قائم ہو چکے ہیں ۔ لندن کا مرکز سب سے بڑا اسلامی مرکز ہے ، یہاں مختلف قسم کی اسلامی سرگرمیاں سال بھر جاری رہتی ہیں ۔ اس کی لائبریری میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں ۔ اس کے مطالعہ کے ہال میں بیک وقت ایک ہزار آدمی بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں ۔ ایک اندازہ کے مطابق ، ہر سال تقریباً ۲۰ ہزار انگریز طلبہ

المرکز الثقافی الاسلامی میں اسلام کے بارہ میں جاننے کے لئے آتے ہیں۔

آپ دنیا کے جس حصہ میں بھی جائیں ہر جگہ ایک چیز ضرور دکھائی دے گی۔ اور وہ مسلمانوں کے اوپر غیر مسلموں کے ظلم کی داستان ہے۔ برطانیہ میں قیام کے زمانہ میں مجھے ایک کتاب ملی۔ اس میں برما کے مسلمانوں پر مظالم کی داستان بتائی گئی تھی۔ اس کا نام تھا ـــــ مسلمو بورما: حملات ابادہ۔

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ برما کی حکومت وہاں کے مسلمانوں کو فنا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر یہ واقعہ کا نصف ثانی ہے۔ اصل یہ ہے کہ برما کے ایک حصہ میں مسلمانوں نے علیٰحدگی کی تحریک چلائی۔ اس کے نتیجہ میں وہ وہاں معتوب ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ برما میں امن کے ساتھ رہ رہے تھے۔

ایک عرب نوجوان نے ایک رپورٹ پڑھنے کے لئے دی۔ اس کا عنوان تھا : بریطانیا ـــــ مشکلات المسلمین۔ اس کے مطابق برطانیہ کا کیس مسلمانوں کے لئے گویا مشکلات کا کیس تھا۔ اس میں برطانی مسلمانوں کی مشکلات کے ذیل میں بغض، سیکولر تعلیمی نظام، نسل پرستی اور تشدد کو شمار کیا گیا تھا اس کے بعد کہا گیا تھا کہ برطانیہ کے مسلمان اگر ان مشکلات کو حل کر لیں تو یہاں اسلام کے لئے عظیم مستقبل ہے (ان الاسلام فی بریطانیا سیکون له مستقبل عظیم اذا تمكنوا من حل المشكلات السابقة) صفحہ ۴۹۲

اس کو پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ ان الفاظ میں موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کی سب سے بڑی غلطی کا راز چھپا ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل کی تعمیر کا آغاز مشکلات کو ختم کرنے سے ہوتا ہے۔ حالاں کہ مستقبل کی تعمیر کا صحیح آغاز یہ ہے کہ مشکلات کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کیا جائے:

زعماء المسلمين يعتقدون ان بناء المستقبل يبدأ من حل المشاكل. والصحيح ان بناء المستقبل يبدأ من الاعراض عن المشاكل واستغلال الفرص.

۲۹ ستمبر کو فجر کی نماز برمنگھم کی سنٹرل مسجد (مرکزی مسجد) میں پڑھی۔ اس میں بیک وقت تین ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اب ایک اور مسجد بنائی جا رہی ہے جس میں پانچ ہزار آدمیوں کے لئے گنجائش ہوگی۔

نمازیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ نماز ختم ہوئی تو چھ آدمی حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ وہ روزانہ اجتماعی

طور پر قرآن پڑھتے ہیں۔ سب کے سب زیادہ عمر کے تھے جن کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ یہ غالباً وہ لوگ ہیں جو اپنے بیٹے یا رشتہ داروں کے ساتھ یہاں مقیم ہیں۔ ان میں کوئی بھی نوجوان موجود نہ تھا۔ مجھے بار بیڈوز کے ایک نوجوان کا قصہ یاد ہے جس کا باپ اس کو اپنے ساتھ مسجد میں لے آیا۔ وہ ایک کنارے الٹا رخ کر کے بیٹھ گیا۔ کسی نے سبب پوچھا تو کہا کہ : me not

مسجد میں مذکورہ منظر دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہ کچھ بوڑھے اور ریٹائرڈ لوگ تو قرآن میں دلچسپی لے رہے ہوں اور نوجوان نسل کہہ رہی ہو کہ : یہ میرے لئے نہیں۔

نماز کے بعد ایک مجلس میں میں نے کہا کہ فجر کی نماز کے بارہ میں ایک بڑی عجیب حدیث ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ من صلی الصبح فھو فی ذمۃ اللہ (جس نے صبح کی نماز پڑھ لی وہ خدا کی ذمہ داری میں آگیا) گویا فجر کی نماز اللہ کی طرف سے حفاظت کی گارنٹی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی پر اسرار بات نہیں بلکہ ایک ایسی بات ہے جو غور و فکر سے سمجھ میں آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز آدمی کے اندر وہ صفات پیدا کرتی ہے جس کے بعد آدمی لوگوں کی دست برد سے محفوظ ہو جائے۔ مثلاً نماز کی چند باتوں کو لیجئے۔ آپ بستر سے اٹھ کر سب سے پہلے وضو کرتے ہیں۔ وضو گویا ایک علامتی فعل کے ذریعہ اس بات کا عزم ہے کہ آپ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے پاک رہیں گے۔ پھر نماز میں بار بار اللہ اکبر کہتے ہیں۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ آپ اللہ کی بڑائی کے احساس میں جئیں گے اور تواضع کی روش اختیار کریں گے۔ پھر آپ ہر رکعت میں الحمد للہ رب العالمین کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہر حال میں اللہ کا شکر کریں گے۔ جو بھی اللہ نے دیا ہے اس پر قانع رہیں گے۔ آخر میں آپ دونوں طرف رخ کر کے کہتے ہیں کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گویا کہ آپ اہل عالم کو یہ بتا رہے ہیں کہ ان کے لئے آپ کے دل میں صرف رحمت اور سلامتی کا جذبہ ہوگا۔

صبح کی نماز میں جو لوگ اس قسم کے اخلاق کی تربیت پا کر نکلیں ان کا یہ اعلیٰ انسانی اخلاق خود ہی ان کی محبوبیت اور حفاظت کی ضمانت بن جائے گا۔

برمنگھم میں میں اپنی رہائش گاہ کے حمام میں گیا تو وہاں جو صابن تھا اس کا نام عنبر تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا ، الصابون الحلال، خال من الدھن الحیوانی :

Halal soap, without animal fat

صابن کے کاغذی ڈبہ پر عربی اور فرنچ اور انگلش میں الرجاء الانتباہ کے تحت لکھا ہوا تھا کہ اکثر صابون کاسٹک سوڈا اور حیوانی چربی کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں۔ مگر عنبر صابون حلال اسلامی صابن ہے جو خالص نباتاتی تیل کے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس کے انگریزی الفاظ کسی قدر فرق کے ساتھ یہ تھے:

Most soaps are produced by using caustic soda and animal fat. Animal fat is not desirable due to religious objections. Amber Soap is specially for molated using pure vegetable oil to satisfy the religious objections and contains no animal fat.

یہ گویا صابن کا اسلامائزیشن تھا۔ یہ اسلامی صابن ایک برٹش فرم نے بنایا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم یہ واضح کر سکیں کہ اسلامی اصول تمہارے لئے مفید اصول ہیں تو دنیا تمام تعصبات کو چھوڑ کر اسلامی اصول کو اختیار کر لے گی۔

جو لوگ مغربی ملکوں میں ہیں وہ مسلم ملکوں کے مقابلہ میں اپنے بچوں کے دین کے لئے زیادہ چوکنا رہتے ہیں۔ شمشاد صاحب کے گھر میں ایک بار میں حمام سے نکل کر اپنے کمرہ کی طرف چلا تو دوسرے کمرے سے آواز آئی۔ مسز شمشاد اپنے صاحبزادے سے کہہ رہی تھیں:

جھوٹ بولنے سے کیا ملا ، گناہ ملا نہ ، لکھ گیا اوپر۔

برمنگھم کی ایک تقریر کے بعد ایک صاحب نے سوال کیا کہ مغربی ملکوں میں ہمارے بچے یہاں کے کلچر سے بہت تیزی سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس سے حفاظت کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ میں نے مذکورہ واقعہ بتاتے ہوئے کہا کہ یہی احول ہر گھر میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ بچہ کے دل میں بچپن سے یہ ڈال دیں کہ تمہارا قول وفعل اوپر لکھا جا رہا ہے تو وہ ساری زندگی کے لئے اس کا چیک بن جائے گا۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں ہم کو حقیقت پسند بننا چاہئے۔ مثلاً اگر آپ یہ مطالبہ لے کر اٹھیں کہ ہمیں سی این این اور بی بی سی کو اسلامائز کرنا ہے تو بظاہر وہ بہت شاندار معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایسا مطالبہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اس لئے ہمیں وہ کرنا ہے جو ممکن ہے اور ہمارے

بس میں ہے۔ اور ممکن اور بس کی چیز یہی ہے کہ ہر گھر کو تربیت گاہ اور دینی مدرسہ بنا دیا جائے۔

ایک عراقی تاجر ابراہیم تھامس نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ حدیث جبریل میں قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ لونڈی اپنا آقا جنے گی (وان تلد الامۃ ربتھا) اس پر سوچتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس سے مراد غالباً (surrogate mother) کا ظاہرہ ہے جو موجودہ زمانہ میں وجود میں آیا ہے۔

جدید مغربی سماج میں دولت مند خاندان کی عورتیں جو بچہ کے حمل کی مصیبت اٹھانا نہیں چاہتیں اور اسی کے ساتھ یہ چاہتی ہیں کہ ان کے پیٹ کی شیپ خراب نہ ہو وہ اس قسم کی تدبیر اختیار کر رہی ہیں۔ خاص طور پر امریکہ میں اس کا رواج دولت مند لوگوں کے یہاں بڑھ رہا ہے۔ اس طریقہ میں یہ کیا جاتا ہے کہ مرد کا اسپرم اور عورت کا ایگ لے کر لیبوریٹری میں فرٹائل کیا جاتا ہے۔ پھر اس کو عورت کے رحم womb میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ عورت کے رحم میں پرورش پاکر اپنے وقت پر پیدا ہو جاتا ہے۔ دولت مند عورتیں اپنی ملازمہ عورت سے یا کسی غریب عورت کو کچھ رقم دے کر ایسا کرتی ہیں۔

اس تشریح کی صورت میں مذکورہ حدیث بالکل لفظی طور پر صادق آتی ہے۔ کیوں کہ اس میں ماں کی حیثیت فی الواقع لونڈی کی ہوتی ہے اور اس کے پیٹ سے جو بچہ نکلتا ہے وہ فی الواقع اس کا آقا ہوتا ہے۔

۲۰ سال پہلے تک سروگیٹ مدر کا تصور موجود نہ تھا۔ ایسی حالت میں ۱۴ سو سال پہلے عرب کے ایک شخص کی زبان سے یہ جملہ نکلنا اس کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ شخص خدا کا پیغمبر تھا۔ اس کے سوا اس کی کوئی اور توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

یہاں کے ایک شخص مسٹر فریڈ نے جناب شمشاد خاں صاحب سے سوال کیا کہ برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ گناہ کرنا اگر گناہ ہے تو گناہ کی بات سوچنا بھی گناہ ہے۔ خدا جب کہتا ہے کہ فلاں کام گناہ ہے اس کو مت کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے خود بھی گناہ کیا۔ کیوں کہ گناہ کا خیال ذہن میں لائے بغیر گناہ نہیں کیا جا سکتا۔

شمشاد خاں صاحب نے جواب دیا کہ ایک مینوفیکچرر ایک سامان بناتا ہے اور اس کے ساتھ

ایک گائڈ بک رکھ دیتا ہے کہ اس سامان کو اس طرح استعمال کرو اگر اس کے خلاف کروگے تو سامان خراب ہوجائے گا۔ ایسی حالت میں کیا مینوفیکچرر مجرم ہے۔ نہیں۔ کیوں کہ مینوفیکچررنے جو کچھ کیا تمہارے فائدے کے لئے کیا۔ ایسی گائڈ دینے کی بنا پر خود اس کو جرم میں شریک نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اس مثال سے تم خدا کے معاملے کو سمجھ سکتے ہو۔ خدا نے جب انسان کو بنایا تو انسان کے لئے جو مفید ترین ہدایات تھیں وہ بھی اس کو پیغمبروں کے ذریعہ بتادیں۔ پھر جب تم مینوفیکچرر کو ہدایت نامہ دینے کی بنا پر مجرم نہیں مانتے تو خدا کو ہدایت نامہ دینے کی بنا پر کیوں ایسا کہہ رہے ہو۔

شمشاد خاں صاحب کے اندر دعوہ ورک کا جذبہ بہت زیادہ ہے۔ ان کا اگرچہ مستقل بزنس ہے مگر ان کی دل چسپی سب سے زیادہ دعوت کے کام سے ہے۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے ایک خوب صورت مرکز (اسلامک پروپیگیشن سنٹر) برنگھم میں قائم کیا ہے۔ ان کے ذریعہ اب تک تقریباً ۵۰۰ لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ وہ ایک زبردست کام کر رہے ہیں جس کا نام ہے: گھر گھر اسلام کا تعارف نامہ پہنچانا:

door to door leaflet drop

گویا کہ یہ وہ کام ہے جس کو حدیث میں ادخال کلمہ کہا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ انگریزی الرسالہ کی بھی مختلف چیزیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ مثلاً انگریزی الرسالہ (مارچ ۱۹۹۳) میں تین صفحہ کا وہ مضمون جس کا عنوان تھا :

From denial to belief

دعوتی کام کے سلسلہ میں انھوں نے کئی عجیب قصے بتائے۔ مثلاً ایک انگریز جس کا قدیم نام ڈیوڈ مورس Dawid Morris تھا۔ ان سے شمشاد خاں صاحب کا ربط قائم ہوا۔ ایک عرصہ تک گفت گو اور مطالعہ کے بعد آخر انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اب نام کا مسئلہ تھا۔ شمشاد خاں صاحب نے کہا کہ نام بدلنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ مگر انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں ہپوکریٹ (منافق) بن کر رہنا نہیں چاہتا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مجھے اپنا نام بھی بدلنا ہے۔ اس کے

کچھ دنوں بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی مسجد میں داخل ہوکر وضو کر رہے ہیں۔ اتنے میں عربی لباس میں ایک بزرگ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز کے لئے جماعت تیار ہے، آجاؤ۔ یہ بزرگ ان کو ڈیوڈ موریس نہیں کہتے۔ بلکہ ان کو محمد اسلام کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس خواب سے وہ نہایت خوش ہوئے اور اپنا نام محمد اسلام رکھ لیا۔ وہ نیوکیسل میں رہتے ہیں اور ایک بڑی سروس میں ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے ایک صاحب روزگار کی تلاش میں سعودی عرب گئے۔ وہاں عرصہ تک وہ پریشان رہے کیوں کہ کوئی کام نہیں ملا۔ اس وقت مکہ میں ایک ہندستانی بزرگ رہتے تھے۔ وہ ان سے دعا کے لئے ملے اور ان کو تحفہ کے طور پر دال روٹی پیش کیا۔ بزرگ نے اس کو خوشی سے قبول کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا کام بن گیا تم دال لائے ہو۔ اس کے شروع میں د کا حرف ہے۔ اسی طرح دین، دولت، دنیا، سب کے شروع میں د ہے۔ تم کو تینوں چیزیں مل گئیں۔

اس کے بعد مذکورہ صاحب کو ایک اچھی سروس مل گئی۔ انھوں نے کافی ترقی کی۔ اس طرح کے واقعات میں بچپن سے سنتا آیا ہوں۔ لوگ ان کو بزرگ کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ وہ محض اتفاق ہے۔

شمشاد خاں صاحب تعلیمی لحاظ سے انجینئر ہیں۔ چنانچہ ان کے اندر یہ خاص ملکہ ہے کہ کسی بات کو نہایت درست الفاظ اور انداز میں بیان کرسکیں۔ ایک روز ان سے منافقت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے کچھ تجربات بتائے۔ میں نے کہا کہ آپ کو اگر ایک جملہ میں منافق کی تعریف کرنا ہو تو آپ کیا کہیں گے۔ انھوں نے ان الفاظ میں منافق کی تعریف کی:

One, who, for some ulterior motives, makes pretences, continuously.

میں نے کہا کہ واقعی یہ منافق انسان کی بہت صحیح اور جامع تشریح ہے۔

پاکستانی روزنامہ جنگ کے لندن اڈیشن (۲۹ ستمبر ۱۹۹۳) میں "لندن نامہ" کے عنوان سے ایک مضمون تھا۔ اس کا پہلا فقرہ یہ تھا:

" برطانیہ اور یورپ میں آباد پاکستانیوں اور کشمیریوں کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے

کہ جس معاشرہ میں وہ رہتے ہیں، یہ نہ تو پاکستانی معاشرہ ہے اور نہ ہی اسلامی معاشرہ۔ اس لئے زندگی گزارنے کے لئے ہمیں بہرحال مقامی معاشرہ کے ساتھ ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ ہماری مجبوری ہے (صفحہ ۳)

باہر کے ملکوں میں ہر جگہ مسلمان اس "مجبوری" کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مگر اپنے ملک میں وہ اس کے لئے تیار نہیں۔ تاہم میں کہوں گا کہ کم از کم ہندستان کی حد تک یہ مجبوری کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں مکمل آزادی ہے۔ یہاں مسلمانوں کو صرف یہ جاننا ہے کہ زندگی کا سب سے اہم اصول ایڈجسٹمنٹ ہے۔ اس اصول کی ضرورت ہندستان میں بھی ہے اور پاکستان میں بھی اور دوسرے تمام ملکوں میں بھی۔

روزنامہ جنگ (۲۸ ستمبر) کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوا کہ پاکستان کی ایم کیو ایم میں ایک بنیادی تبدیلی آئی ہے۔ حتی کہ انھوں نے اپنا نام بدل دیا ہے۔ ایم کیو ایم کا لفظ بدستور باقی رہے گا۔ مگر پہلے اس کا مطلب یہ ہوتا تھا ــــــ مہاجر قومی موومنٹ۔ اور اب اس کا مطلب ہوگا متحدہ قومی موومنٹ۔ ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین جو آجکل لندن میں مقیم ہیں ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو پشاور کے ایک جلسہ سے لندن سے ٹیلیفون پر خطاب کریں گے۔ اس تحریک کے لیڈر پہلے مہاجر قومیت ہونے کو اپنی شناخت بنائے ہوئے تھے۔ مگر یہ تحریک ناکام ہوگئی۔ اب وہ پاکستانی قومیت کو اپنی شناخت بنا رہے ہیں۔ جنگ (۲۹ ستمبر) میں ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ "بالآخر ایم کیو ایم نے مہاجر قومی موومنٹ سے متحدہ قومی موومنٹ کی شکل اختیار کرلی"۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندستان کے مسلمانوں میں بھی ایک اعتبار سے یہی عمل جاری ہے۔ اب تک وہ ہندستان کی عمومی قومیت سے الگ اپنی انفرادی قومیت پر اصرار کرتے رہے تھے۔ مگر ۱۹۹۲ کے بعد ان کی سوچ میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ علیحدہ قومیت کے بجائے اب وہ ہندستانی قومیت کو اپنی شناخت بنانے کی طرف تیزی سے جارہے ہیں۔ یہ ایک صحت مند نقطۂ نظر ہے۔ جیسا کہ مولانا حسین احمد مدنی رح نے کہا تھا: قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے۔

شمشاد خاں صاحب کے یہاں ایک کرسچین خاتون ہفتہ وار صفائی کے لئے آتی تھی۔

اس کا نام پرل تھا۔ وہ اپنی ذاتی کار پر آتی تھی۔ میں نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ یہ گھروں میں صفائی کرنے والے لوگ جاہل ہوتے ہیں یا پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ خاتون جو ہمارے یہاں آتی ہے وہ باقاعدہ تعلیم یافتہ ہے اور اس سے پہلے وہ ایک آفس میں سکریٹری تھی۔ اس نے کسی وجہ سے سروس چھوڑ دی۔ اب وہ گھروں میں صفائی کا کام کر رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ لوگ کام میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ آپ ایک شخص کو دیکھیں گے کہ وہ صفائی کا کام یا اور کوئی بظاہر چھوٹا کام کر رہا ہے۔ حالاں کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوگا۔ اس کے پاس کار اور ذاتی مکان ہوگا۔

یہ بات انڈیا جیسے ملک کے لئے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہاں ایسی حیثیت کا کوئی آدمی صفائی کا کام کرنا کبھی پسند نہیں کرے گا۔ اس قصہ پر مجھے اقبال احمد سہیل مرحوم کی ایک نظم یاد آئی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہمارے اسلاف کس طرح کام کو عار نہیں سمجھتے تھے۔ اس کا ایک شعر یہ تھا :

تھے امام بوحنیفہ کوئن اک بزاز تھے اور فریدالدین سا شیخ اجل عطار تھا

۲۸ ستمبر کی شام کو برمنگھم میں پہلا خطاب تھا۔ یہ اینڈرٹن روڈ (Anderton Road) پر اسپارک بروک سنٹر میں رکھا گیا تھا۔ مقامی مسلمانوں کے علاوہ باہر سے بھی کچھ افراد اس میں شریک ہوئے۔ چھ روزہ قیام کے دوران یہاں اس نوعیت کے چھ خطاب رکھے گئے ہیں۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں اگرچہ ہمارے لئے بہت سی مشکلات ہیں۔ مگر مشکلات زندگی کا حصہ ہیں۔ وہ کسی ایک یا دوسری صورت میں ہمیشہ دنیا میں باقی رہتی ہیں۔ زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ قانون فطرت کے تحت یہاں عسر کے ساتھ یسر بھی لازمی طور پر موجود رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے کسی بھی حال میں مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ آخر میں سوال وجواب کا پروگرام تھا۔

اسی کے ساتھ اسلامی مرکز کی انگریزی کتابوں اور انگریزی الرسالہ کا اسٹال بھی رکھا گیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے یہاں سے کتابیں حاصل کیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج ہر جگہ یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مسلم نسلوں کو اسلام سے بیگانہ

کر دیا جائے اس کے بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسلام دین فطرت ہے۔ کوئی بھی طاقت اس پر قادر نہیں کہ وہ فطرت کو بلڈوز کر سکے۔ ترکی اور روس کی مثالیں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔

۲۹ ستمبر کی شام کو والسل (Walsall) کے اسلامک کلچر سنٹر میں دوسرا خطاب ہوا۔ یہاں میں نے اتحاد کے موضوع پر خطاب کیا۔ میں نے کہا کہ آج ساری دنیا میں مسلمان ایک بلین کی تعداد میں ہیں۔ حالات نے ان کو دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچا دیا ہے۔ ان کے پاس ہر قسم کے وسائل ہمیشہ سے زیادہ موجود ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان جدید دور میں عزت کا مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق نہیں۔

میں نے کہا کہ لوگ کوئی ایک یا دوسری شکایت لے کر باہم لڑنے لگتے ہیں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اتحاد اس وقت ہوگا جب سرے سے شکایت کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔ پھر میں نے صحابہ کے بہت سے واقعات بتائے کہ کس طرح وہ شکایتوں کے باوجود متحد رہتے تھے۔ مثلاً حضرت خالد کو سرداری کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا، مگر اس کے باوجود وہ بدستور مل کر جہاد کرتے رہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی نظر عہدہ پر نہیں ہوتی تھی بلکہ ثواب پر ہوتی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ عہدہ نہیں تو اس سے کیا فرق پڑا۔ ثواب تو ان شاء اللہ مجھے حاصل ہے۔ آج لوگوں کی نظر ثواب کے بجائے عہدوں پر ہو گئی ہے۔ اس لئے ان میں اتحاد نہیں ہونے پاتا۔

۳۰ ستمبر کی شام کو دار العلوم (Coventry Road) میں خطاب تھا۔ اس کا موضوع تھا اسلام میں علم کی اہمیت۔ میں نے کہا کہ عرب کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک عرب عالم سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت مسلمان طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ہر طرف ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ ایسی حالت میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ ہم اپنے عمل کا آغاز کہاں سے کریں۔ (من این نبدأ)

میں نے کہا کہ اس کا جواب تو قرآن میں موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی اتری تو عرب میں بہت سے مسائل تھے۔ کعبہ میں ۳۶۰ بت، رومیوں اور ایرانیوں کا تدخل

یہود و نصاریٰ کی عرب میں موجودگی۔ سماج میں مختلف قسم کے جرائم۔ مگر قرآن میں جو پہلی آیت اتری وہ یہ نہیں تھی کہ — طهر الكعبة من الاصنام یا قاتل الفرس و الرومان یا اخرج الیهود و النصاریٰ من جزیرة العرب یا نفذ حدود الله علی المجرمین۔ اس کے بجائے قرآن کی پہلی آیت یہ تھی کہ پڑھ (اقرأ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائل خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں مگر عمل کا آغاز علم سے کرنا چاہئے۔ یہی طریقہ پہلے بھی اختیار کیا گیا اور یہی طریقہ آج بھی اختیار کرنا ہے۔

ایک مسلمان تاجر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے یہاں بڑی تجارتی کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ اعلیٰ معیار کی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا: اللہ نے ان کو بہت نوازا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی یہ سوچ قرآنی سوچ نہیں۔ کیا آپ مجھے قرآن کی کوئی آیت بتا سکتے ہیں جس میں دنیوی ترقی کو "نوازش" کہا گیا ہو۔ وہ کوئی ایسی آیت نہ بتا سکے۔ میں نے کہا کہ دنیا میں زیادہ ملنا نہ تو نوازش ہے اور نہ کم ملنا غیر نوازش۔ قرآن کے مطابق دونوں حالتیں ابتلاء کی حالتیں ہیں۔ اقتصادی تنگی کو اہانت سمجھنا بھی غلط ہے اور اقتصادی خوش حالی کو اکرام سمجھنا بھی غلط (الفجر ۱۵ - ۱۶)

حدیث میں ہے کہ لكل امة فتنة وفتنة امتي المال۔ اس حدیث میں اس آنے والے دور کی پیشین گوئی ہے جب کہ لوگوں کے لئے سب سے بڑی چیز مال بن جائے گا۔ آج وہی زمانہ ہے۔ تمام لوگ مال کو اپنی دلچسپی بنائے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے۔ اس ظاہری فرق کے ساتھ کہ کچھ مسلمان دولت پرستی کے ساتھ "دین داری" کا ضمیمہ بھی اپنے ساتھ لگائے ہوئے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس ضمیمہ کے بغیر دولت پرستی کے کام میں مشغول ہیں۔

ٹائمس (The Times) کے شمارہ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ بوسنیا ہرزیگووینا میں ۱۷ مہینے کی جنگ کے بعد اس کا ۹۰ فیصد حصہ سرب اور کروٹ کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔ موجودہ پیس پلان میں قدیم یوگوسلاویہ تین نسلی حصوں میں بٹ جائے گا۔ سرب، کروٹ اور مسلمان، مسلم لیڈرشپ تقسیم پر راضی ہوگئی ہے۔ مگر وہ

چاہتی ہے کہ سرب فوج نے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے اس کو وہ خالی کرے اور سمندری ساحل کا چار فیصد حصہ اس کو دیا جائے۔ مگر سرب فوج اس پر راضی نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے جہاں بھی اس قسم کی تحریک اٹھائی ہے، ہر جگہ ان کو پسپائی اختیار کرنی پڑی ہے۔ اراکان (برما) میں، فلپائن میں، فلسطین میں، بوسنیا میں۔ ہر جگہ یہی ہوا ہے کہ مسلم لیڈروں نے زیادہ کی طرف چھلانگ لگائی اور آخر میں صرف کم ہی ان کے حصہ میں آیا۔ یہی اب کشمیر میں ہونے والا ہے۔

مسلمان اس کو اقدام کی سیاست سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا نام اقدام کی سیاست ہو تو پسپائی کی سیاست آخر کس چیز کا نام ہوگا۔

برطانیہ کے مسلمانوں میں اکثریت پاکستان (بشمول بنگلہ دیش) کی ہے۔ اسلامی مملکت میں پاکستانی اور بنگلہ دیشی ایک ساتھ مل کر نہ رہ سکے۔ لیکن انگریز مملکت میں دونوں نہایت اطمینان کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں جب پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تو اس کے پیچھے ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ ذہن تھا کہ :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

برصغیر کے مسلمانوں نے بہت بڑے پیمانہ پر یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو اپنے تشخص کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے ایک علاحدہ خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ مسٹر محمد علی جناح اور دوسرے لوگوں نے اس کی زبردست وکالت کی۔ یہاں تک کہ پاکستان کی صورت میں ایک مسلم ہوم لینڈ بن گیا۔ مگر مسلم ہوم لینڈ بننے کے بعد مسلمانوں نے اس کو صرف زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ اور ہر شخص جس کو موقع ملا وہ پرواز کر کے دوبارہ "اقوام مغرب" کی دنیا میں پہنچ گیا۔

یہ بلاشبہ ایک جرم تھا جو اسلام کے نام پر کیا گیا۔ اس میں مسلمانوں کے لیڈر اور عوام دونوں شریک ہیں۔ اس جرم کی کم سے کم تلافی یہ ہے کہ صاف لفظوں میں اس کا اقرار کر کے اللہ تعالیٰ سے اس کی معافی کی دعا کی جائے۔

برطانیہ میں مقیم ایک عرب کو کچھ سفید فام نوجوانوں نے وحشیانہ طور پر قتل کر دیا۔ ان نوجوانوں

سے انٹرویو لیا گیا جس کو باقاعدہ ٹی وی پر دکھایا گیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ تم نے اس کو کیوں قتل کر دیا۔ نوجوانوں نے صاف کہا کہ ان ایشیائیوں کو ہمیں اپنے ملک سے نکالنا ہے۔ کیوں کہ وہ ہمارے لئے مسئلہ بن گئے ہیں۔ وہ جہاں سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں ورنہ بزور انھیں نکلنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔

برطانیہ میں ایک پارٹی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا نام ہے ــــ برٹش نیشنل پارٹی (BNP) یہ نسل پرست لوگوں کی تنظیم ہے۔ وہ باہر سے آنے والے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو ایشیائی (Asians) کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا مقصد ان ایشیائی لوگوں کو برطانیہ سے نکالنا ہے کیوں کہ وہ ہماری اقتصادیات پر بوجھ بن چکے ہیں۔ یہ لوگ اکثر ایشیائیوں پر حملے کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگ جائیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانیہ کو اپنی اقتصادی مشین چلانے کے لئے لیبر کی سخت ضرورت تھی۔ انھوں نے ایشیائیوں کی آمد کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر ایشیائی ملکوں کے لوگ یہاں آ گئے۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈیا کی تھی۔ مگر اب خودکاری (automation) کا دور آ گیا اور اس کے نتیجہ میں انھیں بیرونی کارکنوں کی ضرورت نہ رہی۔ چنانچہ یہ باہر سے آئے ہوئے لوگ ان کی نظر میں غیر مطلوب (unwanted) بن گئے۔

یہ زبردست خطرہ ہے جو ایشیائیوں کے سر پر منڈلا رہا ہے اور جو سب سے زیادہ مسلمانوں کے حصہ میں آنے والا ہے۔ اس کے جواب میں یہاں کے مسلمانوں میں احتجاج کا ذہن ابھر رہا ہے۔ مگر احتجاج اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اس کا حل صرف ایک ہے، اور وہ دعوت ہے۔ مسلمانوں کو یہاں داعی بن کر رہنا ہو گا۔ اگر انھوں نے احتجاجی سیاست کا طریقہ اختیار کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ ان کا وہی حال نہ ہو جائے جو بوسنیا میں مسلمانوں کا ہوا۔

یکم اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا۔ آج برمنگھم کی مرکزی مسجد (central mosque) میں خطاب کا پروگرام تھا۔ اسی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ خطبہ سے پہلے آدھ گھنٹہ نماز کے موضوع پر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ قرآن و حدیث کے مطابق، نماز صرف ایک ظاہری عمل کا نام نہیں ہے بلکہ ایک اسپرٹ کا نام ہے۔ ظاہری اعمال کا پیمانہ بھی روحانی اور اخلاقی اسپرٹ ہے۔ اگر نماز سے یہ اسپرٹ پیدا

ہو رہی ہو تو وہ مطلوب نماز ہے اور اگر یہ اسپرٹ پیدا نہ ہو تو حدیث کی زبان میں اس سے کہا جائے گا : ارجع فصلّ فانّك لم تصلّ ۔

نماز سے فراغت کے بعد کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اکثر لوگوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ایک صاحب ملے ۔ انھوں نے کہا کہ میرا ایک سوال ہے ۔ میں اس کا جواب چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمائیے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے قرآن کے ترجمہ میں ایک جگہ "شیطان کی اولاد" پڑھا ہے، تو کیا شیطان میں بھی شادی بیاہ کا سلسلہ ہے ۔

پوچھنے والوں کو یہ پوچھنا چاہئے کہ شیطان کی تلبیسات کیا ہیں اور ان سے بچنے کی تدبیر کیا ہے ۔ مگر لوگ عجیب وغریب طور پر یہ پوچھ رہے ہیں کہ شیطان کے یہاں کیا شادی بیاہ اور اولاد کا سلسلہ جاری ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں نہ صحیح دینی فہم پیدا ہوا اور نہ صحیح علمی مزاج۔

جمعہ کی نماز ختم ہوئی تو نماز جنازہ کا اعلان ہوا۔ لوگ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد دو اسٹول لاکر اگلی صف کے آگے بچھائے گئے۔ پھر کچھ آدمی خوبصورت قسم کا ایک لمبا بکس لائے اور اس کو اسٹول کے اوپر رکھ دیا۔ یہ عمدہ لکڑی کا بنا ہوا تابوت تھا۔ اس کے اندر میت تھی اور اس کو نہایت مضبوطی کے ساتھ پیک کر دیا گیا تھا۔ تمام لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کے قانون کے مطابق، جس طرح عیسائی لوگ اپنی میت کو تابوت میں دفن کرتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی میت کو تابوت میں رکھ کر دفن کریں۔ یہ قانون شعبۂ ماحولیات (environmental department) کی طرف سے بنایا گیا ہے۔ یہ تابوت مخصوص کارخانوں میں اہتمام کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ اور وہ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ یعنی ہندستانی روپیہ کے لحاظ سے ۲۵ ہزار روپیہ سے لے کر پچاس ہزار روپیہ تک۔

انڈیا کی حکومت اگر ماحولیاتی تحفظ کے نام پر اس قسم کے تابوت کو ضروری قرار دے تو ہندستان کے نام نہاد رہنما اس کو "شریعت میں مداخلت" قرار دے کر فوراً اس کے خلاف احتجاجی تحریک چلا دیں گے۔ مگر برطانیہ کے دو ملین مسلمان اس کو بلا احتجاج قبول کئے ہوئے ہیں۔ اسی کا نام ایڈجسٹمنٹ ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے ایڈجسٹمنٹ ایک ملک میں جائز ہے اور دوسرے ملک میں ناجائز۔

سمجھ کی کمی

بابری مسجد (اجودھیا) کے نام پر جو پرشور تحریک چلائی گئی اس میں مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ یہ کہتا تھا کہ بابری مسجد کے مسئلہ کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت سی مسجدوں میں سے صرف ایک مسجد نہیں ہے بلکہ وہ ہندستان میں ملت مسلمہ کے وجود کی علامت ہے۔ بابری مسجد کے ساتھ پوری ملت کی قسمت بندھی ہوئی ہے۔ بابری مسجد اگر باقی رہتی ہے تو مسلمان بھی باقی رہیں گے۔ بابری مسجد اگر نہ رہے تو اس کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کے وجود کی بھی کوئی ضمانت نہیں۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد مکمل طور پر ڈھادی گئی۔ حتی کہ اس کی جگہ پر ایک عارضی مندر بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس واقعہ پر اب تین سال گزر چکے ہیں۔ مگر ہندستان کی ملت مسلمہ پوری شان کے ساتھ بدستور موجود ہے۔ اس کی تمام دینی اور ملی سرگرمیاں مزید اضافہ کے ساتھ یہاں جاری ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ مذکورہ علامتی نظریہ سراسر بے بنیاد تھا۔ یہ کچھ سطحی ذہنوں کی خود ساختہ پیداوار تھی۔ اس کا کوئی بھی تعلق نہ تاریخ سے تھا اور نہ دین اسلام سے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام مسائل بے علمی اور کم فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک معاملہ پیش آتا ہے۔ اب جو لوگ اس کو گہرائی کے ساتھ سمجھ نہیں پاتے وہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو ہماری غیرت کے لیے چیلنج ہے ہم کیسے اس پر خاموش رہ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ضمیر کا سوال ہے، ہم کیوں کر اس پر سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے وقار کا مسئلہ ہے پھر کیسے ہم اس کو برداشت کر سکتے ہیں۔

اس قسم کے تمام احساسات صرف کم فہمی کا ثبوت ہیں۔ اس قسم کے لوگ اپنی عدم واقفیت کی بنا پر واقعات کو صرف ایک پہلو سے دیکھ پاتے ہیں۔ وہ اس کے دوسرے پہلوؤں کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں مگر وہ نہیں جانتے۔

ایسے لوگوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ نازک مسائل پر چپ رہیں۔ اپنے قصور فہم کے باوجود اگر وہ بولیں گے تو وہ جرم کریں گے اور یقینی طور پر خدا کے یہاں پکڑے جائیں گے۔ خواہ اپنے خیال کے تحت وہ حق کے لیے ایسا کر رہے ہوں۔

لیڈری نے تباہ کیا

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۹۶۱ - ۱۸۷۰) کی ایک کتاب ہے جس کا نام "چند ہم عصر" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی کچھ ہم زمانہ شخصیتوں پر اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ ایک مضمون میں وہ مولانا محمد علی جوہر کے بارہ میں لکھتے ہیں:

" محمد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔ اس کے رفقا اور اس کے ہم عصر اس کے سامنے پودنے تھے، مگر افسوس اُسے اپنے اوپر قابو نہ تھا اور یہی اس کی ناکامی کی اصل تھی۔ اس کے ایک دوست جو اسے بچپن سے جانتے تھے، اور جنھوں نے زندگی کی ہر منزل میں اُسے دیکھا اور اس کا ساتھ دیا تھا، فرماتے تھے کہ محمد علی کو لیڈری نے تباہ کیا۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ لیڈری کے قابل تھا۔ بشرطیکہ اسے اپنے نفس پر قابو ہوتا۔ وہ جس طرح بیماری میں پرہیز پر قابو نہیں رکھتا تھا اسی طرح ہر معاملے میں جوش کے وقت اپنے اختیار سے باہر ہو جاتا تھا۔ محمد علی کی زندگی بہت سبق آموز اور نہایت عبرت انگیز ہے۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل شخص بھی ابھی بہت پیچھے ہے۔ ہماری ناکامی کے اسباب خود ہم میں موجود ہیں۔ آج جس شئی کے لئے ہم لڑ رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اس کے قابل نہیں۔ ہم جب اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سیرتیں خام، ہماری طبیعتیں ناتربیت یافتہ اور ہمارے نفس چور ہیں، ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت کچھ تربیت کی ضرورت ہے۔ جس چیز کی ہم خواہش کر رہے ہیں اس کے لئے پختہ سیرت اور اعتدالِ طبع کی ضرورت ہے اور وہ ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔"

ڈاکٹر عبدالحق نے مولانا محمد علی کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، وہی موجودہ زمانہ کی تقریباً تمام مسلم شخصیتوں پر صادق آتا ہے۔ ہر ایک کو لیڈری نے تباہ کیا۔ ہر ایک کی بہترین صلاحیتیں چند دن کے شور و ہنگامہ کے بعد ختم ہو گئیں، ان کی صلاحیت نہ خود صاحب شخصیت کے کام آئی اور نہ ملت کو ان سے کوئی حقیقی فائدہ پہنچا۔

اس دوہرا ناکامی کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے ان کا صبر کی صفت سے خالی ہونا۔ قرآن میں ہے کہ —— اور ہم نے ان میں امام (قائد) بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے جب کہ انھوں نے صبر کیا (السجدہ ۲۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیادت کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جس کے اندر صبر کی صفت ہو۔ صبر و تحمل کے بغیر کوئی شخص قوموں کا رہنما نہیں بن سکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قائد تنہائی میں نہیں ہوتا۔ اس کو لوگوں کے درمیان رہنا پڑتا ہے۔ اس کو موافق اور مخالف دونوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس کا معاملہ ان لوگوں سے بھی پڑتا ہے جو اس کی تعریف کریں اور ان سے بھی جو اس پر تنقید کریں۔ وہ کبھی تلخ حالات سے گزرتا ہے اور کبھی نرم حالات سے۔ کبھی کوئی شخص اس کو سہارا دیتا ہے اور کبھی کوئی اس کو دھکا دے کر گرانے کی کوشش کرتا ہے۔

ان مختلف احوال سے نباہ کرنے کا واحد ذریعہ صبر ہے۔ اگر قائد کے اندر صبر کی صفت نہ ہو تو وہ بار بار بھڑک اٹھے گا۔ حقیقت پسندانہ انداز سے رائے قائم کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اس کی منصوبہ بندی اس کی عقل کے بجائے اس کے جذبات کے تابع ہو جائے گی۔ وہ اپنی بے صبری کے نتیجہ میں غیر ضروری چھلانگ لگائے گا اور قیمتی مواقع کو برباد کر دے گا۔

بدقسمتی سے یہی موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام لیڈروں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ مگر اس طرح کی چھلانگوں سے قائد تو بنتے ہیں مگر قوم نہیں بنتی۔

زندگی مسلسل چیلنج کا نام ہے۔ زندگی کبھی مسائل سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جب بھی کوئی لیڈر اٹھتا ہے، اس وقت قوم کسی نہ کسی مسئلہ سے دوچار ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی معاملہ پر ناراضگی کا احساس اس کے اندر موجود رہتا ہے۔ اب ایک لیڈر وہ ہے جو قوم کی ناراضگی کو لے کر تقریریں شروع کر دے اور لوگوں کو بھڑکا کر انھیں مفروضہ دشمن کے خلاف ٹکرا دے۔

دوسرا لیڈر وہ ہے جو حالات کا گہرا جائزہ لے۔ وہ مسائل کی نوعیت کو سمجھے اور قوم کی طاقت کا اندازہ لگائے۔ اور پھر منصوبہ بند انداز میں مسئلہ کے حل کی تدبیر کرے۔ پہلا شخص مسئلہ کے نام پر لیڈری کرنے والا ہے، اور دوسرا شخص مسئلہ کو حل کرنے والا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۱۰۵

۱ آل انڈیا ریڈیو (شعبہ ہندی) نئی دہلی کے نمائندہ مسٹر آر پی شری دھر نے ۲۱ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں جو نفرت اور کٹر پن ہے کیا مذہبی تعلیم اس کی ذمہ دار ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہرگز نہیں، اس کی ذمہ داری صرف اس سطحی قسم کی سیاست پر ہے جو آزادی کے بعد ہمارے یہاں چل پڑی۔

۲ ساون کرپال روحانی مشن کے تحت کرپال آشرم (دہلی) میں ۱۴-۲۱ ستمبر ۱۹۹۵ کو مسٹسزم پر ایک گلوبل کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر ۲۰ ستمبر کو صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۳ ایک سفر کے ذیل میں صدر اسلامی مرکز نے ۲۳-۲۴ ستمبر ۱۹۹۵ کو بمبئی میں قیام کیا۔ وہاں مختلف لوگوں سے ملاقات اور گفت گو ہوئی۔ ایک اسٹوڈیو نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی ایک تقریر کی ویڈیو ریکارڈنگ کی۔ اس تقریر کا موضوع "اسلامی اتحاد" تھا۔

۴ نوراتری وکھیان مالا کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے برہان پور (مدھیہ پردیش) کا سفر کیا۔ وہاں ۲۵ ستمبر ۱۹۹۵ کو ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ اس میں بڑی تعداد میں ہندو اور مسلمان موجود تھے۔ خطاب کا موضوع تھا: ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت اور مشترک کلچر۔ خطاب کے علاوہ دونوں فرقہ کے لوگوں سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔

۵ امریکی میگزین ٹائم کے بیورو چیف مسٹر تھامسن (Dick Thompson) نے ۵ نومبر ۱۹۹۵ کو نئی دہلی میں صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوال وجواب کا خلاصہ مقابل کے صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

۶ بی اے جی فلمس لیمٹڈ (نئی دہلی) کی ویڈیو ٹیم ۲۹ ستمبر ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور زی ٹی وی کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کی سیاست سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کچھ نام نہاد لیڈر مسلمانوں کو بھڑکا کر ٹکراؤ کے راستہ پر ڈالتے تھے۔ مگر اب مسلمان ان لیڈروں کو سمجھ گئے ہیں۔ انھوں نے جان لیا ہے کہ ترقی

Questions and Answers

Q. Why Islam is so strongly associated with terrorism?

A. This is true that some Muslims are engaged in terrorist activities in the name of Islam. But their terrorism has nothing to do with Islam. It is Islam's misuse, not proper use. You will have to differentiate between Muslims and Islam.

Basic reason for present Muslims' engagement in violence is to be traced in their backwardness in modern education. Due to this lacking they are not consciously aware of the modern democratic method. Educational backwardness has rendered them into a case of anachronism.

So far Islam is concerned, it is entirely a peaceful religion. The Qur'an clearly states that 'God calls you to the home of peace' (10:25). Terrorism is totally unlawful in Islam. One of the attributes of a believer finds expression in these words in the Qur'an: 'they enjoin on each other truth, and enjoin on each other patience (103:3). This means that the task of religion is to be performed by adhering to patience in full.

In fact Islamic activism is peaceful activism, or non-violent activism in the full sense of the word, violent activism is in no way permitted in Islam.

Fighting is allowed in Islam in particular circumstances alone, i.e. when one has been left with no option but to fight in defence. The Qur'an states: "Fight for the sake of God those that fight against you, but do not be aggressive. God does not love the aggressors" (2:190).

Moreover, the permission to enter into a war is only for the State and not for the individuals. However, even the State is not permitted to wage a war in aggression. Besides even when another nation initiates hostilities on the Muslim State, it will first of all opt for all possible ways to avoid taking up arms. As Qur'an says: Reconciliation is the best policy (4:128). War in Islam is allowed only in unavoidable circumstances, it is never allowed in normal conditions.

Q. If terrorism is against the teachings of Islam why it is that Islamic scholars and Muslim leaders do not openly condemn it.

A. Just out of fear. If they dare to condemn it openly they will find their names among the hit list of the terrorists. Some do not take stand against the terrorists for fear of losing popularity among the masses, while others out of fear for being enlisted among the hit list.

Q. Are you worried for figuring on the hit list?

A. Absolutely not. I have a sound sleep daily. You know, the greatest joy to be found in this world is to have the conviction that one stands on truth. And I am in possession of this joy, by the grace of God. Then why do I need to worry.

Q. To the present day Muslims who opt for terrorism to achieve their goals, what alternative Islam offers them to achieve their goals.

A. According to Islam, the alternative to them is to completely shun political confrontation and violence, and then whatever opportunities are still available to them, must be availed through peaceful means. In this regards the Qur'an states: With every difficulty there is relief (94:5). That is to say, opportunities always exist side by side with problems. Hence the formula of Islam is: Ignore the problems, avail the opportunities.

November 1. 1995

ہمیشہ ملاپ سے ہوتی ہے نہ کہ ٹکراؤ سے۔

۷ مسٹر وی کے شرما اور ان کی ٹیم ۳۰ ستمبر ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق سورج گرہن کے مسئلہ سے تھا جو ۲۴ اکتوبر کو پڑنے والا ہے۔ انھیں حدیث رسول کی روشنی میں اس کی حقیقت بتائی گئی۔

۸ بھارتیہ ودیا بھون اور حکومت مہاراشٹر کے تعاون سے ۲ اکتوبر ۱۹۹۵ کو بمبئی میں مہاتما گاندھی کی ۱۲۵ ویں جینتی بڑے پیمانہ پر منائی گئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور انگریزی میں ایک پیپر پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا: گاندھی اینڈ نان وائلنٹ ایکٹوزم۔

۹ سنڈے آبزرور کے نمائندہ مسٹر ستیش نوٹیال نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا ٹیلیفون پر انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق سورج گرہن سے تھا جو ۲۴ اکتوبر کو پڑنے والا تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ پیغمبر اسلام نے گرہن کو "خدا کی نشانی" بتایا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام پہلا دین ہے جس نے اس معاملہ میں انسان کو توہماتی عقائد سے باہر نکالا۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۹۵ کو اینگلو عربک نرسری اینڈ پرائمری اسکول (دہلی) میں پانچواں انٹر اسکول کامپٹیشن ہوا۔ موضوع سیرۃ النبیؐ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے چیف گیسٹ کی حیثیت سے اس میں شرکت کی اور اسلام میں تعلیم کی اہمیت پر تقریر کی۔

۱۱ ۲۲ - ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۵ کو فلارنس میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے یورپ کا ایک سفر کیا۔ اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر ملاقاتوں اور خطابات کا پروگرام رہا۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ سفرنامہ کے ذیل میں الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۲ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۸ ستمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: استقلال کی اہمیت۔ اس میں بتایا گیا کہ کامیابی ہمیشہ اس طرح ملتی ہے کہ آدمی پست ہمت نہ ہو اور مسلسل اپنا عمل جاری رکھے۔

۱۳ انٹرنیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ۴ نومبر ۱۹۹۵ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سمپوزیم

ہوا۔ اس کا عنوان تھا:

Message of Sufis for peaceful co-existence.

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تصوف آدمی کے اندر روحانی بلندی پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ منفی احساسات سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان مثبت اخلاقیات کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔

۱۴ مسٹر جمشید عادل نے ۵ نومبر ۱۹۹۵ کو روزنامہ عوام (دہلی) کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق اس سوال سے تھا کہ آنے والے الکشن میں مسلمانوں کی انتخابی پالیسی کیا ہونا چاہئے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی کوئی واحد ملکی پالیسی نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ انھیں اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے مقامی پالیسی بنانا چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ کسی ایک سیٹ پر کئی مسلم نمائندے ہرگز کھڑے نہیں کرنا چاہئے۔

۱۵ اکھل بھارتیہ ہندی اردو پتریکا سمنوے سمیتی کی طرف سے، ۷ نومبر ۱۹۹۵ کو غالب اکیڈمی (دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مسلمانوں کے پچھڑے پن کا ذمہ دار کون۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز اس میں چیف گیسٹ کے طور پر شریک ہوئے اور مذکورہ موضوع پر خطاب کیا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے تھا کہ مسلمانوں کا پچھڑا پن اب پرانی بات ہو چکی ہے۔ مسلمان اب جاگ چکا ہے اور وہ ہر میدان میں آگے بڑھ رہا ہے۔

۱۶ مز کنچنا نے ۹ نومبر ۱۹۹۵ کو دینک ہندستان (ہندی روزنامہ، دہلی) کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ کشمیر کو اٹانومی دینے سے کیا ایسا نہیں ہوگا کہ ملک کی دوسری ریاستیں بھی اس طرح اٹانومی مانگنے لگیں۔ جواب دیا گیا کہ یہ اٹانومی عین وہی ہے جو دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ نے کشمیر کو دستوری طور پر دے رکھی ہے۔ کشمیر کو اٹانومی دینا دستور کی تعمیل ہے۔ جب کہ دوسری ریاستیں اگر اس کی مانگ کریں تو وہ ان کے لئے ایک ایسی چیز کا مطالبہ کرنا

ہوگا جس کا انھیں دستوری طور پر حق ہی نہیں۔

۱۷ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر منوہر موج اور مسٹر وکاس موہن نے ۹ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ بعض پارٹیاں مانگ کر رہی ہیں کہ دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ کو دستور سے حذف کر دیا جائے۔ جواب میں کہا گیا کہ اگر ایسا کیا جائے تو دستور اور قانون کا احترام ختم ہو جائے گا۔ اور لوگوں میں لاقانونیت کا مزاج بنے گا۔ اس طرح دستور کی ایک دفعہ حذف کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سارا دستور بلکہ پورا قانونی نظام عملاً حذف ہو کر رہ جائے گا۔

۱۸ مدرسہ قادریہ مسروالا (ہماچل پردیش) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ہماچل پردیش کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں علاقہ کے اندر مختلف پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

خصوصی اعلان

دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو، ہندی اور انگلش تینوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی۔ جب کہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کر دی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطور خود اور مقامی اصحاب خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔

منیجر ماہنامہ الرسالہ

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اُردو	Rs.
تذکیرالقرآن جلد اول	200/-
تذکیرالقرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	50/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	70/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	40/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	70/-
اسلام اور عصرِ حاضر	50/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	–
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	95/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	100/-
کتابِ زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	35/-
عقلیاتِ اسلام	50/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	8/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	10/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	20/-
حقیقت کی تلاش	12/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	12/-
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعددِ ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	12/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	-
The Teachings of Islam	-
The Good Life	-
The Garden of Paradise	-
The Fire of Hell	-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	10/-
Words of the Prophet	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	.55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

الرسالہ



Delhi Postal Regd. No. DL/11154/96

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333